زندگی بے بندگی شرمندگی

حُبِّ الٰہی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جذبۂ محبت

کلامِ پاک میں سورۂ احزاب کی آخری آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ والاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ أنْ يَحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً ۝ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ط وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الاحزاب : ۷۲،۷۳)

(ہم نے اس امانت کو آسمانوں، اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اُٹھالیا۔ بیشک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ اس بار امانت کو اُٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں؛ اور مشرک مردوں اور مشرق عورتوں کو سزا دے، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول فرمائے اور اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔)

اِن آیات کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی ایسا مشکل کام اپنے ذمہ لے لیا تھا، جس سے زمین، آسمان اور پہاڑ سب ڈر گئے تھے اور انھوں نے اس امانت کو اٹھانے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ مگر انسان نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے زیادہ کمزور ہونے کے باوجود اس ذمہ داری کو اُٹھالیا۔ اور اب جب اُٹھا ہی لیا ہے تو ظاہر ہے، اگر اس ذمہ داری کو پورا کرے گا تو انعام کا مستحق ٹھہرے گا اور اگر نہ پورا کرے گا تو سزا پائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرما ہی دیا:

"..... تا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں

کو سزا دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول کرے۔۔۔"

اب سوال یہ ہے کہ وہ ذمہ داری کیا تھی جو انسان نے اُٹھائی اور جسے یہاں امانت کا نام دیا گیا ہے۔ علماء نے اس لفظ "امانت" کی تشریح میں بہت کچھ کہا ہے جس کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ انسان نے یہ ذمہ داری اُٹھائی تھی کہ دُنیا میں خدا کا نائب بن کر رہے گا اور اس کے بھیجے ہوئے احکام دین کو تسلیم کرے گا۔

یہ کام کہ انسان دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا صحیح نائب بن کر رہے اور اس کے بھیجے ہوئے احکامِ دین کو خود بھی مانے اور دوسروں کو بھی ماننے کی دعوت دے، ایک بڑا ہی مشکل اور کٹھن کام ہے۔ جس نے اس کام کو بے انتہا مشکل بنا دیا ہے، وہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے انسان کو سیدھا راستہ اختیار کرنے یا غلط راہ پر چل نکلنے، دونوں کا اختیار بخش دیا ہے۔ وہ چاہے تو اپنے پیدا کرنے والے کو مانے اور چاہے تو اس کا انکار کر کے کسی حقیر سے حقیر چیز کے آگے سر جھکا دے۔ چاہے تو نیکی کا رویّہ اختیار کرے اور چاہے تو اکڑ میں آکر نافرمان بن بیٹھے۔

پھر ایک تو اسے برائی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور دوسرے اس کے ساتھ اس کے ازلی دُشمن "شیطان" کو بھی لگا دیا گیا ہے جو ہر وقت برائی کو خوشنما بنا کر اس کے سامنے پیش کرتا اور اسے بہکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر انسان کے لیے یہ کام بے انتہا مشکل بنا دیا ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا فرماں بردار نائب بن کر رہے اور اس کے بھیجے ہوئے احکام پر عمل کرے۔ برائی کو کر گزرنے کا اختیار ہونے کے باوجود برائی سے بچنا اور ایک ایسے دشمن سے اپنے دین و ایمان کو بچا لینا جو ہم میں خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے، یہ منزل بڑی کٹھن منزل ہے اور یہ راہ بڑی دشوار گزار راہ ہے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب ایک اور حقیقت ہے جسے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ ربّ العالمین نے جو کام دُنیا میں مشکل رکھے تھے ان میں آسانی پیدا کرنے والے اسباب بھی ساتھ ہی پیدا کر دیئے تھے۔ اور جذبہٗ محبت انہیں اسباب میں ایک سبب ہے۔ یہ جذبہ زندگی کی مشکلات میں آسانی پیدا کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے سفر میں جو راہیں زیادہ کٹھن تھی وہاں اس جذبے کو زیادہ افراط سے رکھ دیا گیا ہے تاکہ مشکلات کے احساس کو کم کرتا رہے۔ مثال کے طور پر انسانی بچے کی پیدائش اور پرورش ماں کے لیے اتنی بڑی تکلیف دہ چیز ہے کہ صرف

اُسی کی جان جانتی ہے کہ وہ اس راہ میں کتنی مشقت برداشت کرتی اور ذہنی اور جسمانی اذیت سہتی ہے۔ مگر جہاں اس پر اتنا بوجھ ڈالا گیا ہے وہاں اس کے دل میں بچے کی محبت کا جذبہ اتنا شدید رکھ دیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ سہہ جاتی ہے، اس کا پورا احساس بھی اُسے نہیں ہوپاتا کیوں کہ اس کی ممتا اس کی ہر مشکل کو آسان کرتی چلی جاتی ہے۔

اسی مثال کو پوری زندگی پر قیاس کر لیجیے۔ انسان نے ایک بڑی بھاری ذمہ داری اُٹھائی ہوئی ہے کہ دُنیا میں خدا کا فرماں بردار نائب بن کر رہے گا۔ پھر یہ کام اُسے اسی عالم آب و گل میں کرنا ہے جہاں چاروں طرف آزمائشیں بکھری پڑی ہیں اور جہاں ایک کینہ پرور دشمن کا ہر دم کا ساتھ ہے جس نے دُنیا میں آنے سے پہلے ہی چیلنج دے دیا تھا کہ:

قَالَ رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (الحجرات: ۳۹)

(وہ (ابلیس) بولا: "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا۔)

جو کچھ شیطان نے اس وقت کہا تھا، اسے وہ آج اس دُنیا میں صبح و شام کیے چلا جا رہا ہے۔ وہ نت نئے ہتھکنڈوں سے انسان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے تاکہ انسان اس ذمہ داری کو پورا نہ کر سکے جو اُس نے اس وقت اُٹھائی تھی جب آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے اسے اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔

اس ازلی دُشمن کو زیر کرنا اور دُنیا میں نافرمان بننے کا اختیار ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے احکام کا مطیع بن کر رہنا، یہ اتنا کٹھن کام ہے کہ عام انسانی محبتیں اس میں آسانی پیدا کرنے سے عاجز محض تھیں۔ چناں چہ اس دشوار کام میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے چند بنیادی قسم کی محبتیں رکھ دی گئی ہیں، یعنی:

- خدا کی محبت
- خدا کے رسول (ﷺ) کی محبت
- خدا کے بھیجے ہوئے دین کی محبت

یہ محبتیں جتنی شدید ہوں گی، خدا کا مطیع و فرماں بردار نائب بننے کا کٹھن کام اتنا ہی آسان

ہو تا چلا جائے گا۔اور جتنی یہ محبتیں سطحی قسم کی ہوں گی، یہ راہ اتنی ہی دشوار لگنی شروع ہو جائے گی۔اور اگر خدانخواستہ یہ محبتیں دلوں سے مٹ گئیں تو پھر انسان کو کبھی یہ یاد بھی نہیں آئے گا کہ اس نے کبھی کسی بات کی ذمہ داری اُٹھائی بھی تھی۔ پھر انسان کی یہ مجرمانہ غفلت ایسی مسلسل اور متواتر ہو جائے گی کہ اسے اسی وقت ہوش آئے گا جب خالقِ کائنات اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے بصد جاہ و جلال دریافت فرمائے گا کہ اے آدم کے بیٹے !وہ وعدہ کیا ہوئے جو تم نے ہم سے کیے تھے اور وہ ذمہ داری کیا ہوئی جو تو نے اس وقت اُٹھائی تھی جب آسمانوں، زمین، اور پہاڑوں نے اسے اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔

دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا جگہ پکڑ لینا وہ خوش بختی ہے کہ جب یہ حاصل ہو جائے تو یہ دُنیوی زندگی ہی بہشت بن جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ دلوں میں اللہ کی محبت کے گہرا ہو جانے کے باعث دُنیوی مشکلات و مصائب بالکل ختم ہو جاتے ہیں ـــــ انہیں تو بشر کی زندگی میں بہر حال رہنا ہی ہو تا ہے۔ تاہم حبّ الٰہی کا جذبہ ان کی شدت اور اذیت کو بے انتہا کمزور کر دیتا ہے اور بہت سے ایسے حادثات و واقعات جنہیں عام لوگ بڑی بڑی مصیبتیں سمجھتے ہیں۔ حبّ الٰہی کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے سرے سے مصیبتیں بنتے ہی نہیں۔

مثلاً دنیاوی جاہ و جلال اور مال و زر کا ضائع ہو جانا، عام لوگوں کے لیے بہت بڑی مصیبت ہوتی ہے مگر خدا کو سچے دل سے چاہنے والوں کے لیے یہ کوئی مصیبت نہیں، کیوں کہ حب الٰہی کے باعث ان کی قلبی کیفیت ان نیک، بزرگوں جیسی ہو جاتی ہے جن کے تجارتی جہاز کے ڈوب جانے اور سامانِ تجارت کے فنا ہو جانے کی خبر پہنچی تو انھوں نے جزع فزع کرنے کے بجائے الحمد للہ کہا۔ کچھ دیر کے بعد اطلاع آئی کہ وہ پہلی خبر غلط تھی، جہاز سالم ہے اور سامانِ تجارت بھی محفوظ ہے۔ یہ سن کر انھوں نے پھر وہی الفاظ کہے کہ الحمد للہ۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ جب آپ کو نقصان پہنچنے کی خبر ملی تو بھی آپ نے خدا کا شکر ہی ادا کیا؛ اور جب نقصان سے بچ جانے کی اطلاع پہنچی تو بھی آپ نے خدا کا شکر ہی ادا کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ جب مجھے اتنے بڑے نقصان کی اطلاع پہنچی تو میں نے اپنے دل میں غور کیا کہ کہیں میرا دل اس نقصان کی خبر سن کر بہت پریشان تو نہیں ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل پر اس نقصان نے کوئی خاص اثر نہیں ڈالا اس لیے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دل دنیاوی دولت کی محبت میں گرفتار

نہیں ہے اسی طرح جب مجھے جہاز کے محفوظ ہونے کی اطلاع ملی تو دوبارہ میں نے غور کیا کہ کہیں دل یہ بات سن کر بہت خوش تو نہیں ہوا۔ تو دوبارہ مجھے یہی پتہ چلا کہ جس طرح میرا دل نقصان کی خبر سے زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا، اسی طرح نقصان سے بچ جانے کی خبر سے بھی زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ چناں چہ میں نے دوبارہ شکر ادا کیا کہ میرا دل دنیاوی دولت کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا۔

اسی طرح دُکھ، بیماری یا کسی عزیز پیارے کا دُنیا سے چلے جانا دل رنجور کے لیے سخت اذیت کا باعث بنتا ہے۔ اور ان حادثات سے تو وہ لوگ بھی متاثر ہو جاتے ہیں جن کے دلوں میں خدا کی محبت جگہ پکڑ چکی ہوتی ہے۔ تاہم یہ تاثرا نہیں بے قراری کے اس درجے پر نہیں پہنچا تا کہ وہ ہوش وحواس کھو بیٹھیں۔ یا اللہ ربّ العالمین سے شکوے شکایتیں شروع کر دیں۔

حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم اپنی آخری سانس لے رہے تھے۔ شدّتِ غم سے حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن زبانِ مبارک سے صرف یہی فرمایا کہ:

"اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں، مگر زبان سے وہی نکلے گا جو پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوگا!" (مسلم)

عمرو بن علاء خلیفہ ہشام سے ملنے چلے۔ راستے میں ان کے پاؤں میں کوئی زہریلا مادّہ پیدا ہو گیا۔ جب وہ شام پہنچے تو سارا زہر پورے بدن پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اطبا کو بلایا گیا تو سب نے بالاتفاق رائے دی کہ جب تک پاؤں نہ کاٹا جائے گا، آرام نہیں آئے گا۔ لوگوں نے بیہوش کرنے کی تیاریاں کیں، مگر عمرو نے کہا:

"خدا کی قسم! میں یہ نہیں چاہتا کہ خدا کے ذکر سے غافل رہوں۔"

جب ٹانگ کاٹی گئی تو نگاہ آسمان کی طرف اُٹھائی اور کہا:

"اے اللہ! اگرچہ تو نے میرا ایک عضو لے لیا۔ لیکن دوسرے اعضا تو باقی ہیں!"

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ انہیں اطلاع ملی کہ ان کا ایک بیٹا چھت سے گر کر مر گیا ہے انھوں نے پھر آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور کہا:

"اے اللہ! اگرچہ تو نے میرا ایک بیٹا لے لیا ہے لیکن تیرے دیئے ہوئے دوسرے بیٹے تو موجود ہیں۔ اے اللہ! ہر حالت میں تیرا شکر ہے!"

غرضیکہ حبِ الٰہی کا جذبہ ایک ایسا مخلص، ہمدرد اور دل سوز رفیق ہے جو ہر دم ساتھ رہتا،

ہر پریشانی میں دل جوئی کرتا، ہر غم سے بچاتا اور ہر حال میں سہارا بنتا ہے۔ یہ کتاب جو پیش کی جارہی ہے، اس کا موضوع یہی حب الٰہی ہے جو تمام محبتوں کی اصل اور جڑ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت، اور دین کی محبت بھی اسی سرچشمے سے نکلی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسی لیے محبوب ہیں کہ وہ خدا کے رسول ہیں، اور دین بھی اسی لیے پیارا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا دین ہے۔

جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں اور جس طرح اسلام وطن کے اندر بے وطن ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے پیش نظر اسلام کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے والوں کی منزل اتنی کٹھن ہو چکی ہے کہ ان بنیادی محبتوں کو دل میں نقش کیے بغیر یہ راہیں کبھی طے نہ ہو سکیں گی۔

محبت کی بنیاد

محبت کی بنیاد واقفیت پر ہوتی ہے۔ عموماً ہم انہیں ہستیوں سے محبت کرتے ہیں جن سے ہمیں واقفیت حاصل ہوتی ہے اور جن کی صفات کو ہم جانتے ہیں، بالکل ناواقف ہستی سے محبت پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ چناں چہ دلوں میں اللہ تعالیٰ کی سچی محبت تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے اس کی ذات اور صفات سے واقفیت حاصل ہو۔

اسلام کے بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ خدا پر ایمان ہے۔ خدا پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات اور صفات دونوں پر ایمان ہو۔ یعنی اس پر بھی ایمان ہو کہ وہ موجود ہے اور اس پر بھی ایمان ہو کہ وہ تمام اچھی صفات کا جامع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ٩٩ نام ہیں جن میں سے ہر نام ایک خاص صفت بتاتا ہے۔ چناں چہ یہ ننانوے نام صفاتی کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانے سے یہ مراد ہے کہ ان صفاتی ناموں میں خدا تعالیٰ کی جتنی صفات بیان ہوتی ہیں۔ ان سب پر ایمان لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے کچھ ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

الرَّحمٰنُ	بہت زیادہ مہربان
الرَّحِیْمُ	نہایت رحم والا
اَلْمَلِكُ	بادشاہ
اَلْقُدُّوس	بے حد پاک
اَلْمُؤْمِنُ	امن دینے والا
اَلْمُھَیْمِنُ	نگہبانی کرنے والا
اَلْمُقِیْتُ	روزی دینے والا
اَلرَّزَّاقُ	بہت رزق دینے والا
اَلْمُنْتَقِمُ	انتقام لینے والا

اَلتَّوَّابُ	بہت توبہ قبول کرنے والا
اَلْعَظِیْمُ	عظمت والا
اَلْبَصِیْرُ	دیکھنے والا وغیرہ

اللہ تعالیٰ کی ننانوے صفات پر ایمان لانا یہ ہے کہ ان صفات پر ایسا پکا قلبی یقین ہو کہ وہ یقین اعمال پر بھی اثرانداز ہو۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بَصِیْر ہے یعنی دیکھنے والا۔ ویسے ماننے کی حد تک سبھی اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دیکھنے والا ہے۔ مگر ماننے والوں میں سے کتنے ہیں، جن کا یہ احساس اتنا گہرا ہے کہ انہیں برائیوں سے روک بھی لیتا ہے۔ وہ یہ یقین رکھتے ہوئے بھی کہ خدا ہر وقت دیکھ رہا ہے اور وہ برائیوں کی سزا دینے والا ہے۔ بے جھجک برائیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نظری حد تک تو اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دیکھنے والا ہے۔ مگر یہ ماننا ان کے دلوں میں اس حد تک نقش نہیں ہوا کہ انہیں برے کاموں سے روک بھی لے۔

عربی زبان میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے کہ ایک باپ اپنے کمسن بیٹے کو لے کر پرائے باغ میں جا گھسا۔ اس نے بیٹے کو درخت کے نیچے کھڑا کیا اور اسے سمجھایا کہ میں درخت کے اوپر چڑھ کر پھل توڑتا ہوں تم اِدھر اُدھر دیکھتے رہنا۔ اگر باغ کے مالک یا مالی وغیرہ کو آتے دیکھو تو آہستہ سے مجھے بتا دینا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔

بچے کو باپ کی یہ حرکت اچھی تو نہ لگی مگر وہ خاموش رہا۔ باپ درخت کے اوپر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد بچے نے دھیمی سی خوف انگیز آواز نکال کر کہا:

"ابا جان! کوئی دیکھ رہا ہے!"

باپ جلدی سے نیچے اُتر آیا۔ مگر جب اِدھر اُدھر دیکھنے پر اسے کوئی شخص نظر نہ آیا تو اس نے ناراض ہو کر کہا:

"اجی کون دیکھ رہا ہے؟ مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔"

بچے نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی اور کہا:

"وہ دیکھ رہا ہے۔"

اب باپ اور بیٹا دونوں ہی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ خدا بَصِیْر ہے اور ہر وقت دیکھ رہا

ہوتا ہے مگر باپ کا یہ جاننا صرف جاننے کی حد تک تھا۔ اور بیٹے کا یہ جاننا اس کا ایمان بن چکا تھا۔!

اب اللہ کی چند اور صفات پر غور کیجیے:

وہ اَلْمُقِیْتُ — یعنی روزی دینے والا بھی ہے

وہ الرَّزَّاقُ — بہت رزق دینے والا بھی ہے

وہ اَلْمُنْتَقِمُ — یعنی انتقام لینے والا بھی ہے

اور اگر ہم واقعی یہ ایمان رکھتے ہوں کہ خدا المقیت، الرزّاق اور المنتقم ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم روزی کی تلاش میں حرام دروازوں کو نہ کھٹکھٹائیں اور حلال دروازوں پر ہی توجہ رکھیں، کیونکہ روزی تو ہر صورت میں اسی کی طرف سے آتی ہے۔ اگر ہم اس روزی کو ایسے ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جنہیں اس نے حرام قرار دے دیا ہے تو وہ اس روزی کے ساتھ ہمیں اپنی ناراضگی اور قہر بھی دے گا کیوں کہ وہ 'المقیت' اور 'الرزّاق' ہونے کے علاوہ المنتقم بھی ہے۔

پھر روزی جب اسے دینی ہے تو روزی کے حصول کے سلسلے میں اپنے ہی جیسے کمزور اور بے بس انسانوں کے دروازوں پر ذلیل و خوار کیوں ہوا جائے۔ اور پتھر، چونے، لکڑی کے پتلوں کے آگے ناکیں رگڑ کر انسانیت کو ذلیل کیوں کیا جائے۔

جب ہم حصولِ زر کی خاطر رشوت، غبن، بددیانتی، دھوکہ، فریب، قمار بازی، سود خوری کی طرف رُجوع ہو جاتے ہیں یا پست اخلاق اور بے دین انسانوں کی خوشامدیں کرتے ہیں یا زندہ اور فوت شدہ بے بس انسانوں سے حاجتیں مانگتے ہیں۔ اس وقت در حقیقت ہمیں اس بات پر کوئی ایمان نہیں ہوتا کہ اللہ رب العالمین 'مقیت' بھی ہے اور 'رزّاق' بھی اور 'منتقم' بھی۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت 'توّاب' بھی ہے، یعنی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا۔ اس صفت پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو پورا یقین ہو کہ اگر اس نے سمندر کے جھاگ کے برابر بھی گناہ جمع کر لیے ہیں۔ تو بھی اگر وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئندہ کے لیے اصلاح کا عہد کرلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہوں کو معاف کر دے گا کیوں کہ وہ 'توّاب' بھی ہے اور اس کے توّاب ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسانوں کو گناہوں سے رُک جانے اور حق کی طرف آنے کا موقع بہم پہنچاتا رہے۔ ہاں جب کسی گنہگار کی موت ہی اس کے سامنے آموجود ہو تو پھر البتہ اس کی توبہ کو شرفِ قبولیت نہیں بخشا جاتا۔ کیوں کہ موت کے سامنے آجانے پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا

ہے۔اس سے پہلے پہلے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور مہربان پروردگار رحمت سے توجہ فرمانے پر ہر دم تیار ہوتا ہے۔

رسول مقبول ﷺ نے ایک جگہ وضاحت فرمائی ہے کہ بندے کے توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اسی طرح خوش ہوتا ہے جس طرح وہ شخص خوش ہوتا ہے جس کا اونٹ صحرا میں کھو گیا ہو، اس کا کھانا اور پانی اسی اونٹ پر لدا ہو، اس کے کھوئے جانے کے بعد اسے اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا ہو۔ پھر اچانک اسے وہ اونٹ مل جائے اور اس کے مل جانے پر وہ اس قدر مسرور ہوا ہو کہ شدّتِ مسرّت سے اس کے منہ سے اُلٹ پلٹ جملے نکلنا شروع ہو جائیں اور وہ بجائے یہ کہنے کے کہ "اے خدا! تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔" یہ کہہ جائے کہ اے خدا میں تیرا رب ہوں اور تو میرا بندہ ہے (نعوذ باللہ) جتنی مسرّت اس شخص کو رہتی ہے اتنی ہی اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے توبہ کرنے پر ہوتی ہے!

فارسی کے ایک مشہور شاعر ابوسعید ابوالخیر کی ایک رُباعی ہے:

باز آ باز آ ، ہر آں چہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں در کہ ، درگہ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

"واپس آجا، واپس آجا، جہاں بھی تو ہے وہاں سے واپس آجا۔ اگر تو کافر ہے یا آتش پرست ہے یا بت پرست ہے تو بھی تو واپس آجا۔ ہماری یہ درگاہ ناامیدی کی درگاہ ہے ہی نہیں۔ چاہے تو نے سو بار توبہ توڑی ہو تو بھی واپس آجا۔"

غرض کہ اللہ تعالیٰ کو صحیح معنوں میں 'توّاب' ماننے والوں کے لیے ہمیشہ یہ موقع موجود رہے گا کہ وہ گناہوں سے توبہ کر کے ایک پاکیزہ زندگی کا آغاز کر سکیں۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "عظیم" بھی ہے یعنی بہت عظمت والا۔ اس کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے ذرا اس کائنات پر غور کیجیے جس کا وہ خالق ہے یہ کائنات کتنی وسیع ہے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا معلوم کر لینا کافی ہے کہ سائنس اپنی بے پناہ ترقی کے باوجود ابھی تک اس کی حدود کو معلوم نہیں کر سکی۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ شاید کسی دن اس کی حدود کا پتا چل

جائے گا، مگر یہ امکان بھی موجود ہے کہ یہ لامحدود ہو۔

کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کائنات میں کتنی اور دُنیا موجود ہے اور ان میں کون کون بستا ہے۔ کائنات کے بعض سیارے زمین سے اتنی دُور ہیں کہ درمیانی فاصلوں کو ناپنے کے لیے کوئی موجود انسانی پیمانہ کافی نہیں ہوتا تھا۔ چناں چہ ایک اصطلاح گھڑی گئی جسے نوری سال کہا جاتا ہے۔ نوری سال کا کتنا فاصلہ ہوتا ہے اسے اس طرح سمجھایا جاتا ہے کہ روشنی ۱۸۶,۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اگر کوئی اس روشنی کی رفتار سے چلے تو ایک سال کے اندر وہ جتنا طے کرے گا، اسے ایک نوری سال کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک نوری سال ۵,۸۸۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ میل کا فاصلہ بنتا ہے۔

واضح رہے کہ دُوربین نے بعض ایسے سیاروں سے متعارف کرایا ہے جو زمین سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر ہیں۔ ذرا اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ یہ کائنات کتنی بڑی اور کتنی وسیع ہے کہ انسانی عقل اس کی وسعت کی بے پناہی کے آگے ششدر کھڑی رہ جاتی ہے۔

ہماری یہ زمین جسے ہم اتنی بڑی اور وسیع سمجھتے ہیں۔ کائنات کے مقابلے میں ایک حقیر ذرّے کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ پھر اس حقیر ذرّے کے اندر رہنے والا ایک حقیر تر ذرّہ یعنی انسان اور دوسری طرف اس بے پایاں کائنات کا پیدا کرنے والا اور سنبھالنے والا وہ ربّ عظیم، ان دونوں ہستیوں کا آپس میں کوئی مقابلہ ہے؟ مگر اس کے باوجود انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ اس حقیر ذرّے، انسان نے مارے حماقت کے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ اس ربّ جلیل کا مدّمقابل بننے کے دعوے کیے۔ اور ایسے انسان تو کروڑوں کی تعداد کو پہنچتے ہیں جنھوں نے اس کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسے نہ ماننے پر مصر رہے۔ انسان یہ احمقانہ غلطی اسی لیے تو کرتا ہے کہ وہ اس کی صفتِ 'عظیم' کے صحیح احساس سے عاری ہے۔

یہی حال اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کا ہے۔ ان صفات کو صحیح معنوں میں ماننے کے کچھ تقاضے ہیں۔ اور اگر یہ تقاضے پورے نہ ہوں تو پھر اس کا یہی مطلب ہے کہ ذہنی لحاظ سے تو خدا کی ان صفات کو مانا جارہا ہے مگر دل پر اس کا کوئی اثر نہیں اس لیے عملی طور پر ان کا انکار کیا جارہا ہے۔

غرض کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس کی ذات اور صفات سے پوری واقفیت ہو اور ان پر پورا پورا ایمان لایا جائے۔

توحید

وہ ایک غریب طالب علم تھا۔ ایک طرف علم کا شوق بے پناہ تھا اور دوسری طرف صحت بے حد کمزور تھی۔ ایک سال اس پر ایسا آیا کہ چھ ماہ اس نے کالج کے ہوسٹل میں گزارے اور چھ مہینے ایک اسپتال کے جنرل وارڈ میں۔ اگرچہ اوّل الذکر تعلیمی ادارہ تھا اور آخر الذکر طبّی ادارہ، مگر اتفاق کی بات کہ ان دونوں اداروں کے اندرونی حالات حیرت انگیز طور پر ایک جیسے تھے۔

کالج میں پرنسپل اور وائس پرنسپل کے باہمی تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ اگرچہ رتبے کے لحاظ سے پرنسپل بڑا تھا، مگر بدقسمتی سے وائس پرنسپل وزیر تعلیم کا کوئی قریبی رشتہ دار تھا، اور اس تعلق نے اسے سخت بد دماغ بنا دیا تھا۔ وہ پرنسپل کو پرِ کاہ وقعت نہ دیتا اور ہر معاملے میں من مانی کرنے ہی میں سکون محسوس کرتا۔ پرنسپل بھی صورتِ حال کو خوب سمجھتا تھا اور بہت سے معاملات میں وائس پرنسپل سے دَب بھی جاتا تھا۔ تاہم چوں کہ وہ ادارے کا سربراہ بھی تھا، کئی امور میں اسے اپنی رائے منوانے پر اصرار بھی ہوتا تھا۔ اُدھر وائس پرنسپل کا یہ حال تھا کہ وہ بزعم خود پورا پرنسپل بن چکا تھا اور کسی معاملے میں بھی چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اپنی رائے کو چھوڑنے میں ہیٹی محسوس کرتا تھا۔ غرضیکہ صورتِ حال ایسی تھی کہ گویا کالج کو ایک پرنسپل نہیں، بلکہ دو پرنسپل چلا رہے ہیں۔

ان دو حاکمیتوں نے ادارہ کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ پڑھانے والا اسٹاف، پڑھنے والے طلباء، دفتر کے کلرک، ہوسٹل کا عملہ، بلکہ کالج کے مالی، چپراسی، جمعدار تک دو دھڑوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک دھڑا پرنسپل کا تھا اور دوسرا وائس پرنسپل کا۔ جس طرح وہ دونوں ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے رہتے، اسی طرح ہر گروہ دوسرے گروہ کو "خوشامدی" چاپلوس، اور "چمچے" کے خطاب دیتا رہتا۔ پرنسپل کی حامی پارٹی تو پرنسپل کی حمایت اس لیے کرتی کہ وہ پرنسپل تھا۔ اور اسی کو ان کی خفیہ رپورٹیں لکھنی تھیں، وائس پرنسپل کی پارٹی اوّل الذکر سے بھی زیادہ دُور بینی کا ثبوت

دے رہی تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ پرنسپل تو دو ایک سال میں ریٹائر ہو جاتا ہے، اس کے بعد وائس پرنسپل ہی ادارے کا سربراہ ہوگا؛ اس لیے ابھی سے اس کی نگاہوں میں محترم بننے کی کوشش شروع کر دی جائے۔

دونوں دھڑے اپنے اپنے لیڈر کے حضور میں حاضر ہو کر غیبتیں کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیوں میں مصروف رہتے تھے، اور طالب علموں کا برا حال تھا۔ نہ وقت پر کلاسیں لی جاتی تھیں، نہ لیکچر ٹھیک طریقے سے تیار کیے جاتے تھے؛ اسٹاف روم میں بیٹھ کر دونوں گروہ اس طرح بلند اور غصیلی آواز میں ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے کہ طلبہ کے دلوں سے ان کا احترام زائل ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ایک غریب گھر کا بیٹا تھا، دُکھیا ماں نے پتہ نہیں کس طرح مشقتیں کر کر کے اُسے یہاں تک پہنچایا تھا۔ ایک قصبے کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد اب ایف۔ ایس۔ سی۔ میڈیکل کی پڑھائی ویسے ہی اس کے لیے بہت مشکل تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ سائنس اسٹاف آرٹس اسٹاف سے بھی کچھ زیادہ ہی جھگڑوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ کیونکہ وائس پرنسپل فزکس کا لکچرر تھا؛ اور سائنس اسٹاف، جائز و ناجائز، ہر بات میں اس کی حمایت کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا تھا۔ ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ بمشکل چند بار پریکٹیکل ہوئے تھے اور لیکچروں کا حال بھی خراب تھا۔

دفتر میں کلرک بھی کام کم، اور سازشیں زیادہ کرتے تھے۔ کالج کے بڑے بڑے پلاٹ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث اپنی دل کشی کھوتے چلے جا رہے تھے۔ برآمدوں اور کمروں میں گرد پڑی ہوتی۔ اور کالج کے مالی اور جمعدار بیٹھے کالج کی سیاست پر بحثیں کر رہے ہوتے۔

ہر وقت کی فکر اور ذہنی کوفت نے اُسے اتنا بیمار کر دیا کہ اسے مقامی سرکاری اسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل ہونا پڑا۔ داخل ہوتے وقت اسے ڈاکٹر نے یہ بتایا تھا کہ اُسے صرف چند ہفتے ہی اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ لیکن اس بیماری نے وہ طول کھینچا کہ وہ چھ ماہ تک وہیں پڑا رہا۔ ایک تو امتحان کی فکر جان کھاتی رہتی، اور دوسرے اسپتال کی حالت بھی دو حاکمیتوں نے اسی طرح خراب کر رکھی تھی جیسے کالج کی۔

اسپتال میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اور اس کے ماتحت ڈاکٹر میں چلی ہوئی تھی۔ ان دونوں بزرگ ہستیوں کو، جنھیں اسپتال کی دُنیا میں ایم۔ ایس۔ اور ڈی۔ ایم۔ ایس۔ کے ناموں سے پکارا

جاتا تھا، ایک دوسرے سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہاں بھی وہی کالج والی صورت تھی۔ ایم۔ ایس۔ اگرچہ اسپتال کی سب سے بڑی شخصیت تھا، اور اصولاً سب کو اس کی اطاعت کرنی چاہیے تھی، مگر ڈی۔ ایم۔ ایس۔ کو یہ فخر حاصل تھا کہ سکریٹری صحت، اس کے ماموں کا گہرا دوست تھا۔ ایم۔ ایس۔ نے کوشش کی کہ وزیر صحت تک پہنچ کر ڈی۔ ایم۔ ایس۔ کو زک پہنچائے، مگر وائے بدنصیبی کہ وزیر صحت بھی ڈی۔ ایم۔ ایس۔ کے برادرِ نسبتی کا ہم زلف نکلا۔ اب صورت یہ تھی کہ اسپتال میں عہدے کے لحاظ سے ایم۔ ایس۔ بڑا تھا اور اثر ور سوخ کے لحاظ سے ڈی۔ ایم۔ ایس۔ اسپتال کے نیام میں یہ دونوں تلواریں کسی صورت میں نہیں سما رہی تھیں، اور ان کے ٹکراؤ نے وہ چھنا کے پیدا کر رکھے تھے کہ نہ مریض آرام سے سو سکتے تھے، اور نہ عملہ یکسوئی سے کام کر سکتا تھا۔ اسپتال کے سب چھوٹے ڈاکٹر، نرسیں، ڈسپنسر، بیرے، آیائیں؛ یہاں تک کہ اسپتال کے باورچی خانوں میں کام کرنے والے باورچی مائیاں، جمعدارنیاں، تک دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ہر گروہ کو اسپتال کے مریضوں کے علاج معالجے اور بندوبست سے زیادہ اہم بات یہ معلوم ہوتی تھی کہ ایک دوسرے کو زک پہنچائے اور نیچا دکھائے۔

چھ مہینوں میں بغیر کسی باقاعدہ علاج اور مناسب دیکھ بھال کے وہ لوٹ پیٹ کر کسی نہ کسی طرح کچھ ٹھیک ہو کر گھر پہنچا تو ایف۔ ایس۔ سی۔ کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس کا سال تو ضائع ہو گیا مگر ایک بہت بڑی حقیقت اس کے دل و دماغ پر پوری طرح نقش ہو گئی۔ ان دو سالوں کے دوران میں، جو اس نے کالج اور اسپتال میں گزارے، اسے یہ آیت بار بار یاد آتی رہی:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ ۭبِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۙ (المومنون : ۹۱)

(اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔)

اگر یہ چھوٹے چھوٹے ادارے بھی ایک سے زیادہ سربراہوں کے ماتحت رہ کر باہمی چپقلش کا شکار ہو جاتے ہیں تو پھر اتنی پرپیچ کائنات کو اگر ایک سے زیادہ چلانے والے چلا رہے ہوتے تو اس کا

کیاحال ہوتا؟

ہوش سنبھال کر اس نے اپنے ماحول سے یہی سیکھا تھا کہ خدا ایک ہے۔ مگر اب ان دو سالوں کے تجربے نے جس طرح خدا کی وحدانیت کو اس کے ذہن نشین کیا، اس نے اسے واقعی پکا موحد بنادیا۔

اسلام ہمیں جس خدا پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے، اس کی صفات میں سے جس صفت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ اس کا ایک ہونا ہی ہے۔ اسی کو 'توحید' کہتے ہیں اور توحید دین اسلام کا بنیادی پتھر ہے۔

انسانیت کا آغاز توحید ہی سے ہوا تھا کیوں کہ سب سے پہلا انسان پیغمبر تھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو توحید ہی کا درس دیا تھا۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، بعض وجوہ کے باعث لوگوں میں گمراہیاں پھیلتی گئیں۔ ان گمراہیوں میں سب سے بڑی گمراہی یہی تھی کہ اگرچہ انسانوں کی غالب اکثریت خدا کو مانتی رہی، مگر وہ اس کے "ایک ہی معبود" ہونے کے قائل نہ رہے؛ اور یہ لغزش وہ بنیادی لغزش تھی جو انھیں بتدریج گناہوں کی دَلدلوں میں پھنساتی چلی گئی، مارے جہالت اور حماقت کے کسی نے بتوں کو پوجنا شروع کردیا، کسی نے چاند ستاروں کے آگے سر جھکالیا، کسی نے اس سے بھی زیادہ بے بس مخلوقات کو رب ماننا شروع کردیا۔ اس دوران میں بار بار انبیاء آتے رہے اور انسانوں کو توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہے۔ مگر انسان بار بار اس سبق کو بھولتا رہا۔ آخر جب محمد ﷺ انسانوں کے لیے ایک آخری اور ہمیشہ رہنے والی شریعت لے کر آئے تو اس آخری شریعت میں بھی جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ خدا کا ایک ہونا ہی ہے۔

کلام پاک میں 'توحید' کا مضمون جگہ جگہ بیان ہوا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَآ إِلٰـهَ اِلَّا هُوَ لا وَالمَلائِكَةُ وَ اولُوا العِلمِ قَائِماً بالقِسْطِ ط لَآ إِلٰـهَ اِلَّا هُوَ العَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (آل عمران: ۱۸)

(اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔)

إِنَّنِيٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا فَاعبُدْنِي وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكرِي ۝ (طه: ۱۴)

(میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔)

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَآ إِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ... (محمد: ۱۹)

(پس اے نبیؐ، خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔)

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، تمام انبیاء توحید پر خصوصی زور دیتے رہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحاً إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ط إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (الاعراف: ۵۹)

(ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔)

وَ إِلٰى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوداً ط قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ط اَفَلاَ تَتَّقُوْنَ ۝ (الاعراف: ۶۵)

(اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟)

وَ إِلٰى ثَمُوْدَ أَخَاهُمْ صٰلِحًا م قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ط (الاعراف: ۷۳)

(اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ لا إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِى ط قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰـهَكَ وَ إِلٰـهَ آبَاءِكَ إِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ إِلٰـهًا وَّاحِداً ج صلے وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(البقر: ۱۳۳)

(پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟

اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا: "بچو میرے بعد تم کس کی بندگی کروگے؟
ان سب نے جواب دیا: "ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اور اسحٰقؑ نے خدا مانا اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔)

وَقَالَ اللّٰهُ لاَ تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ج اِنَّمَا هُوَ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ج فَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۝ (النّحل : ۵۱)

(اللہ کا فرمان ہے کہ: دو خدا نہ بنالو، خدا تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔)

اس وسیع و عریض کائنات کے نظام پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنی مخلوقات اس میں پائی جاتی ہیں، وہ حساب و شمار سے بالکل باہر ہیں۔ بڑی بڑی زبردست اور طاقتور مخلوقات بھی موجود ہیں اور چھوٹی چھوٹی حقیر اور انتہائی کمزور چیزیں بھی؛ ایک طرف وہ عظیم الشان اجرامِ سماوی ہیں کہ اگر چلتے چلتے کبھی ہماری زمین سے ٹکرا جائیں تو اسے پاش پاش کر دیں؛ اور دوسری طرف وہ ننھی سی چہچہانے والی چڑیا بھی ہے جو مزے سے پھدکتی رہی ہے۔ چڑیا تو پھر بھی ایک بڑی چیز ہے؛ کبھی برسات کی راتوں میں آپ چراغ جلا کر بیٹھیں اور پھر دیکھیں کہ جو پتنگے اس پر آتے ہیں، ان میں سے ایسے جاندار بھی ہیں جن کی جسامت ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہوتی۔

آخر وہ کون ہے جو ان تمام زبردستوں اور کمزوروں کو اس طرح سنبھالے ہوئے ہے کہ ہر مخلوق لگے بندھے قوانین کے مطابق اپنی اپنی راہ زندگی پر چلتے رہنے پر مجبور ہے اور زبردست سے زبردست مخلوق بھی اس طرح مسخر ہے کہ اپنے مدار سے نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف حقیر اور کمزور مخلوقات کی طرف دیکھیے کہ زبردست مخلوقات سے بھری ہوئی اس کائنات میں وہ کس مزے اور آرام سے جیے چلی جارہی ہیں۔ اگر اس کائنات کو چلانے والے ایک سے زیادہ ہوتے تو کیا یہ بندوبست اور حسن انتظام قائم رہ سکتا تھا؟

پھر مختلف اقسام کی مخلوقات اپنی اپنی زندگی کے لیے جس طرح باہمی تعاون کی محتاج ہیں، وہ بہت قابل غور ہیں۔ کسی ایک مخلوق کی نشو و نما کے لیے اور بہت سی مخلوقات کام کرتی ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ نشو و نما پاتی ہے۔ انسان کی بات تو چھوڑیئے، کہ وہ ہے ہی معاشرتی حیوان۔ ذرا ایک گیہوں کے دانے پر ہی غور کیجیے۔ جب تک زمین، پانی، ہوا اور سورج اس سے تعاون نہ کریں، وہ کسی صورت نشو و نما نہیں پا سکتا۔ اب اگر زمین، پانی، ہوا اور سورج مختلف خداؤں کے ماتحت ہوتے تو کیا

پھر بھی یہ ممکن تھا کہ وہ اس دل سوزی اور یکسوئی کے ساتھ متفق ہو کر دانے کی پرورش کرتے؟ مختلف عناصر کا متفق ہو کر دوسرے عناصر کی نشو و نما میں امداد دینا واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ سب عناصر کسی ایک ہی آقا کے غلام اور فرماں بردار ہیں۔

حضور رسولِ اکرم ﷺ کی احادیث بھی واضح کرتی ہیں کہ آں حضرت (ﷺ) نبی بننے سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک توحید خالص کا درس دیتے رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم کی گئی ہے: (۱) اس حقیقت کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا اور (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔" (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

"رسول خدا (ﷺ) ایک سفر میں تھے کہ ایک بدّو سامنے آ کھڑا ہوا اور اس نے آپ کے ناقہ کی مہار پکڑ لی۔ پھر کہا: "اے اللہ کے رسول! (یا آپ کا نام لے کر کہا کہ اے محمد! (ﷺ) مجھے وہ بات بتائیں جو مجھے جنت سے قریب اور آتشِ دوزخ سے دُور کر دے۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول خدا ﷺ رُک گئے۔ پھر اپنے رفیقوں کی طرف نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ اس کو اچھی توفیق ملی (فرمایا کہ اس کو خوب ہدایت ملی) پھر آپ نے اس بدوی سے فرمایا کہ ہاں، ذرا پھر کہنا اس نے اپنا سوال پھر دُہرایا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور نماز قائم کرتا رہ اور زکوٰۃ ادا کرتا رہ اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا رہ۔ یہ بات کر کے حضور ﷺ نے اس بدوی سے فرمایا کہ اب ہمارے ناقہ کی مہار چھوڑ دے!" (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے بیان کیا کہ جب رسوا خدا ﷺ نے معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا:

"تم وہاں اہل کتاب میں سے ایک قوم کی طرف پہنچو گے۔ پس جب تم اُن کے پاس جاؤ تو ان کو اس کی دعوت دینا کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ تمہاری بات مان لیں اور یہ شہادت ادا کریں تو پھر تم انھیں بتانا کہ اللہ نے دن رات میں تم پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پھر جب وہ اس میں بھی تمہاری اطاعت کریں تو اس کے بعد تم ان کو بتانا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء و مساکین کو دے دی جائے گی۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ بات بھی مان لیں تو ان کے عمدہ مال چھانٹ کر لینا، اور مظلوم کی بدُعا سے بچنا کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے!" (بخاری، مسلم)

حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں، تو اللہ نے اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دی!" (مسلم)

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ ایک ہی سواری پر سوار تھا اور میرے اور آپ کے درمیان کجاوے کے پچھلے حصے کے سوا اور کوئی چیز حائل نہ تھی۔ آپ نے مجھے پکارا:

"معاذ بن جبل!"

میں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ و سعدیک" (یعنی میں حاضر ہوں۔ ارشاد فرمایئے)

پھر کچھ دُور چلنے کے بعد آپ (ﷺ) نے فرمایا:

"معاذ بن جبل!"

میں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ و سعدیک"

پھر کچھ دُو چلنے کے بعد آپ (ﷺ) نے فرمایا:

"معاذ بن جبل!"

میں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ و سعدیک!"

آپ نے فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ اللہ عزّ و جل کا بندوں پر کیا حق ہے؟"

میں نے عرض کیا: "اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔"

آپ (ﷺ) نے فرمایا: "اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں!"

پھر کچھ دُور چلنے کے بعد آپ نے فرمایا:

"معاذ بن جبل!"

میں نے عرض کیا: "لبیک یا رسول اللہ وسعدیک!"

آپ نے فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ جب بندے اللہ کا یہ حق ادا کر لیں تو پھر اللہ پر ان کا کیا حق ہے؟"

میں نے عرض کیا: 'اللہ اور اس کے رسول ہی کو زیادہ علم ہے!"

آپ نے فرمایا: "یہ کہ انہیں عذاب میں نہ ڈالے!" (بخاری، مسلم)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

" لاَ اِلٰـهَ اِلاّ الله کی شہادت دینا جنت کی کنجی ہے!" (مسند احمد)

حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص اس حال میں دنیا سے رخصت ہوا کہ وہ یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو وہ جنت میں جائے گا!" (مسلم)

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ لاَ اِلٰهَ الاّ اللّٰه کے قائل کے لیے دوزخ حرام ہو جاتی ہے؛ انہیں پڑھتے وقت ایک اصولی بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس قسم کی خوش خبریوں والی احادیث میں حضور ﷺ کی مراد کسی نیک کام کی ذاتی خاصیت اور اس کا اصلی اثر بتانا ہوتا ہے، قطع نظر اس کے کہ اس نیکی کو کرتے وقت اگر کچھ اور قسم کی برائیاں بھی جاری رکھی گئیں تو پھر انجام کیا ہوگا؟

اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طبیب کسی خاص دوائی کی خاصیت بتاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ جو شخص اطریفل کھاتا رہے گا، وہ ہمیشہ نزلے سے محفوظ رہے گا۔ یہ بات کرنے سے اس کی مراد یہ ہے کہ اطریفل کی ذاتی خاصیت یہ ہے کہ اسے استعمال کرتے رہنے سے انسان نزلے، زکام سے بچا رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اطریفل کے ساتھ تیل، ترشی اور دوسری سخت نزلہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی استعمال کرنا شروع کر دے اور توقع رکھے کہ چونکہ وہ ان بد پرہیزیوں

کے ساتھ اطریفل بھی کھا رہا ہے، اس لیے اسے نزلہ ہرگز نہیں ہوگا؛ تو ظاہر ہے کہ اس کا ایسا سمجھنا نادانی ہوگا۔

اسی اصول کی روشنی میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ توحید کی ذاتی خصوصیت یہی ہے کہ اس کا قائل دوزخ سے بچا رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نادان توحید کا قائل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی بد عملیاں بھی شروع کر دے جن کا انجام قرآن و حدیث نے عذاب پانا اور دوزخ میں جانا ہی بتایا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل کسی ایسے انسان کا نہیں ہو سکتا جو واقعی مومن اور موحد ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل تو **لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ** کا قائل ہونا ہے اور اس کا ادنیٰ درجہ تکلیف دینے والی چیز کو راستے سے ہٹا دینا ہے، اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہیں۔" (بخاری، مسلم)

غرضیکہ جتنے اسباق انسانیت کو پڑھائے گئے ہیں، ان میں یہ سبق سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ ان کا معبود ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے علاوہ مجددین اور مصلحین بھی اپنی اپنی جگہ توحید کا پرچار کرتے رہے۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن فرماتے ہیں:

"**لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ** کو دل میں گاڑ دو۔ اگر فرشتے دل پھاڑ کر دیکھیں تو یہ اندر گڑا ہوا ہو"

شرک اور کفر

شرک اور کفر دونوں الفاظ ایک معنی میں بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔ تاہم کفر کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا بالکلیہ انکار کیا جائے اور شرک یہ ہے کہ خدا کو مانا تو جائے مگر اس کی مخصوص صفات میں دوسری ہستیوں کو شریک کیا جائے، اور ان کے آگے وہ مراسم عبودیت بجالائے جائیں جو صرف خدا ہی کے آگے بجالائے جاسکتے ہیں مثلاً سجدہ کرنا، اس کے نام کے نذر و نیاز وغیرہ۔

اگر کوئی شخص سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو، تو یہ کفر ہے۔ لیکن اگر کوئی خدا کے وجود کو تو مانے اور یہ بھی تسلیم کرے کہ وہ کائنات کا خالق ہے، مگر یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کا عقیدہ یہ ہو کہ کوئی دیوی یا دیوتا یا پیر یا چاند یا سورج یا ستارے یا فرشتے یا جن یا کائنات کی کوئی اور مخلوق مجھے تندرستی بخش سکتی ہے، یا میری روزی بڑھا، یا گھٹا سکتی ہے یا میری موت کو ٹال سکتی ہے، یا غیب کا علم جانتی ہے، تو اس کا ایسا سوچنا چونکہ خدا کی مخصوص صفات میں دوسروں کو شریک کرنا ہے، اس لیے اسے شرک کہا جائے گا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف کائنات کا خالق ہی نہیں، بلکہ وہ کائنات کو سنبھالنے والا اور اس کا بندوبست کرنے والا بھی ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے اور زمین و آسمان میں ایک پتہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ اس کائنات میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس میں کوئی سیارہ، کوئی فرشتہ، کوئی جن، کوئی دیوی، کوئی دیوتا، کوئی پیر، کوئی فقیر، کوئی چاند یا کوئی سورج بااختیار ہو سکے اور خدا کے حکم کے بغیر کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکے۔

واضح رہے کہ تاریخ انسانی میں ایسے لوگ کم رہے ہیں جو خدا کا بالکلیہ انکار کریں زیادہ تر انہیں گمراہوں کا حال ملتا ہے جنھوں نے خدا کی ہستی کو تو مانا مگر اس کو واحد اور قادرِ مطلق نہ مانا بلکہ دوسری مخلوقات کو خدائی میں اس کا شریک جانا۔

قرآن میں 'کافر' کا لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ جنھوں نے خدا کے وجود کا انکار کیا اور ان لوگوں کے لیے بھی جنھوں نے خدا کے وجود کو تو مانا مگر اس کے ساتھ شرک بھی

کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر کا ایک مطلب "نہ ماننا" اور "انکار کرنا" بھی ہے چوں کہ اللہ تعالیٰ نے شرک سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔اس لیے جو شخص شرک کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے سب سے بڑے حکم کو ماننے سے انکار کرتا ہے، لہٰذا وہ کافر ہوا یعنی نہ ماننے والا اور انکار کرنے والا۔

شرک اس کائنات میں سب سے بڑا گناہ ہے۔کوئی برے سے برا اور گھناؤنے سے گھناؤنا گناہ بھی خدا کو اتنا ناگوار نہیں جتنا شرک — کیوں کہ شرک کرنے والا اپنی نجات کی منزل کی طرف پشت کر کے مخالف سمت کی طرف منہ کر لیتا ہے۔اب وہ جتنے قدم بھی اُٹھاتا چلا جائے گا، اپنی نجات سے دُور تر ہوتا چلا جائے گا۔وہ رؤف ورحیم مالک جو اپنے بندوں پر، ماں سے بھی زیادہ مہربان ہے، آخر اسے ایسے ضرر رساں کام کی کیسے اجازت دے سکتا ہے؟

کلامِ پاک میں شرک سے متعلق بے شمار آیات آئی ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

سورۂ نساء آیت نمبر ۱۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ط وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيْداً ۝ (النساء : ۱۱۶)

(اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔)

سورۃ الانعام آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا ہے:

.... قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

(الانعام : ۱۹)

(... کہو، خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔)

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَإِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهِ وَ هُوَ يَعِظُهُ يٰبُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ط إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان : ۱۳)

(یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: بیٹا، خدا کے

ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔)

سورۂ نساء آیت ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوا بِهٖ شَيۡئًا ..... ۝ (النساء: ۳۶)

(اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ.....)

کلامِ پاک میں والدین کی اطاعت کا بڑی تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے مگر اس معاملے میں بھی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر والدین شرک کا حکم دیں تو پھر ان کی ہرگز اطاعت نہ کی جائے۔

سورۂ لقمان آیت ۱۵ میں ارشاد ہوا ہے:

وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ... (لقمان: ۱۵)

(اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان......)

سورۂ زمر آیت ۶۴ میں فرمایا گیا ہے:

قُلۡ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ تَاۡمُرُوۡنِّىۡۤ اَعۡبُدُ اَيُّهَا الۡجٰهِلُوۡنَ ۝ (الزمر: ۶۴)

(اے نبیؐ) ان سے کہو، پھر کیا اے جاہلو، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟)

تمام انبیاء کو شرک سے بچنے کی شدید تاکید کی گئی۔ سورۂ زمر آیت ۶۵ میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے:

وَلَقَدۡ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ وَ اِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝ (الزمر: ۶۵)

(تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔)

جن ہستیوں کو خدا کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے، ان کی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَرُوۡنِىۡ مَا ذَا خَلَقُوۡا مِنَ

الاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ... ۝ (الاحقاف : ۴)

(اے نبیؐ! ان سے کہو، "کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انھوں نے کیا پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے؟)

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ۝ (الفرقان : ۳)

(لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اعتبار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے ہیں، نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں۔)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِاجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝

(الحج : ۷۳)

(لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔)

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (الاحقاف : ۵)

(آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے انھیں پکار رہے ہیں۔)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"میں شرک کے سب شرکاء سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ پس جو شخص کوئی عمل کرے جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے تو میں اس کو اور اس کے شریک، (دونوں) کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ:

"میں اس سے بے زار اور بے تعلق ہوں، وہ عمل صرف اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے کیا!" (مسلم)

ایک خطبے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے اپنے سارے بندوں کو توحید کی فطرت پر شرک سے یکسو بنا کر پیدا کیا۔ پھر ان کے پاس شیطان آئے اور ان کو ان کے دین سے ہٹا دیا۔ اور جو چیزیں میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں، ان شیطانوں نے وہ ان کے لیے حرام بنا دیں اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ میرے ساتھ ایسی چیزوں کو خدائی میں شریک ٹھہرائیں جن کے لیے میں نے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔ (مسلم)

اسبابِ شرک

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسانیت کا آغاز توحید سے ہوا تھا اور دُنیا میں آنے والا سب سے پہلا انسان نبی تھا تو اس دنیا میں شرک کیسے پھیل گیا؟

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان میں بھلائی اور برائی، دونوں کے مادّے رکھے ہوئے ہیں۔ پھر برائی کے مادے کو اُبھارنے کے لیے انسان کا ازلی دشمن شیطان بھی مصروفِ عمل رہتا ہے۔ وہ شروع ہی سے انسان کا دشمن ہے، کیوں کہ وہ انسان کو راندۂ درگاہ ہونے کا سبب گردانتا ہے۔ اس ازلی دُشمن کو اس میں سکون ملتا ہے کہ جیسے انسان اس کی بدبختی کا سبب بنا تھا، وہ بھی انسان کو بدبخت بنا کے چھوڑے، جس طرح انسان اُسے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے گرانے کا ذریعہ بن گیا تھا؛ وہ بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے گرانے کا ذریعہ بنے۔ جس طرح انسان سبب بنا اس کے بہشت سے نکالے جانے کا، اسی طرح وہ بھی انسان کے اس پرسکون سرزمین سے ہمیشہ محروم ہو جانے کا سبب بنے اور اسے اس بدعملی کی طرف خصوصی طور پر ابھارے جس سے اسے سب سے زیادہ سختی کے ساتھ روکا گیا تھا، یعنی شرک۔

انسانوں میں شرک پھیل جانے کے اسباب پر صاحبِ علم لوگوں نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے جو اپنی اپنی جگہ درست ہی معلوم ہوتی ہیں۔

فرشتوں کا تصوّر

شرک پھیلنے کے اسباب کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ انسانوں کو فرشتوں کا جو صحیح تصوّر دیا گیا تھا، اس نے بعد میں بگڑ کر دیوی، دیوتاؤں کی شکل اختیار کرلی، اور بت پرستی کا ذریعہ بن گیا۔ فرشتوں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ مختلف فرشتے اللہ تعالیٰ کی اس کائنات کے مختلف کاموں پر معین ہیں، کوئی انسان کو روزی پہنچانے کاموں پر متعین ہے، کوئی انسانوں کی جان لینے پر، کوئی انبیاء کے پاس وحی لانے پر، کوئی قیامت کے دن صور پھونکنے پر، اسی طرح بعض فرشتے انسانوں کے اچھے اور برے اعمال لکھنے پر متعین ہیں۔ بعض قبروں میں میتوں سے کچھ سوالات پوچھنے کے ذمہ دار ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب اس کے بعد جب ہم بت پرست قوموں کے بت پرستانہ نظام پر غور کرتے ہیں تو وہاں بھی یہی صورتِ حال ملتی ہے کہ ان کے مختلف بت، ان کے خیال کے مطابق، مختلف کاموں پر متعین ہیں۔ کوئی محبت کی دیوی ہے، کوئی نفرت کی، کوئی دولت کی دیوی ہے، کوئی علم کی۔ کوئی دیوتا خلق کرنے والا ہے، کوئی سنبھالنے والا، کوئی مارنے والا۔ کسی دیوی کا بیماری سے تعلق ہے، کسی کا تندرستی سے۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ شروع میں انسانوں کو فرشتوں کا تصوّر دیا گیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ کائنات اور انسان سے تعلق رکھنے والے مختلف کاموں پر متعین ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہالت کے باعث لوگوں نے ہر فرشتے کو اپنے اپنے کام میں بااختیار سمجھنا شروع کردیا۔ پھر جب انھیں بااختیار سمجھ لیا گیا تو اس سے اگلا قدم یہی ہو سکتا تھا کہ زندگی کے جس معاملے میں بھی کوئی حاجت پیش آئے اسے براہِ راست خدا سے مانگنے کے بجائے اس مخصوص فرشتے سے مانگا جائے جو اس معاملے پر متعین ہے؟ اور ایسے ہی کیا بھی گیا اسی شے نے آہستہ آہستہ دیوی، دیوتاؤں اور بت پرستی کی شکل اختیار کرلی۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اسلام کے پانچ بنیادی عقیدوں میں فرشتوں پر ایمان

کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے اور بے شمار مخلوقات پیدا کیں اور کسی پر بھی بحیثیتِ نوع ایمان لانا ضروری قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ بھی یہی بتائی جاتی ہے کہ فرشتوں کا تصور چوں کہ پہلے بگاڑ کا شکار ہو کر شرک کا سبب بن چکا ہے اس لیے رسول مقبول ﷺ جو آخری شریعت لے کر آئے، اس میں توحید پورے طور پر خالص رکھنے کے لیے فرشتوں پر ایمان لانے کو بنیادی عقیدوں میں رکھ دیا گیا ہے۔

کائنات میں فرشتوں کی ٹھیک حیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک گھر کی مثال پر غور کریں۔ اس گھر کا ایک مالک ہے جو اس گھر میں پورے طور پر بااختیار ہے۔ اس نے گھر کے مختلف کاموں کے لیے مختلف نوکر رکھے ہوئے ہیں، کسی کو اس نے کھانا پکانے کا حکم دیا ہوا ہے، کسی کو سودا لانے کا، کسی کو بستر بچھانے کا اور کسی کو گھر صاف کرنے کا، اسی طرح گھر کے اور بہت سے کام اس نے مختلف نوکروں کے ذمے لگا رکھے ہیں۔

اب غور کیجیے کہ ان نوکروں کی حیثیت اس گھر میں تابعداروں کی سی ہے، آقاؤں کی سی تو نہیں؟ جو باورچی کھانا پکا رہا ہے اس کا کام بس کھانا پکانا ہی ہے۔ اسے یہ اختیار تو نہیں کہ جس ہمسائے کو چاہے وہ کھانا اٹھا کر دے بھی دے۔ کھانا اگر کسی کو دیا جائے گا تو وہ تو مالک کے حکم سے ہی دیا جائے گا۔

اسی طرح جو نوکر بستر بچھا رہا ہے، اس کا کام بستر بچھانا ہی ہے۔ وہ یہ تو نہیں کر سکتا کہ جس اجنبی کو چاہے، اُن بستروں پر سونے کی اجازت بھی دے دے۔ جو نوکر سودا لانے جائے گا اس کا کام مالک کا بتایا ہوا سودا لانا ہی ہے۔ اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ مالک اسے گوشت اور پھل لانے کو کہے اور وہ دال اور ساگ لے آئے۔ یا سودا لانے کے بجائے باہر بانٹ آئے۔

اسی طرح باقی سب باتوں کو قیاس کر لیجیے۔ اس گھر کے نوکر کام کرنے کے ذمہ دار ہیں، اختیارات کے مالک نہیں۔ اختیارات تو سب مالک کے اپنے ہاتھ ہی میں ہیں۔ اگر کسی کو اس گھر سے کچھ لینا ہو گا تو وہ مالک ہی سے مانگے گا، نوکر اسے کچھ بھی دینے کے مجاز نہیں ہیں۔

بس یہی حیثیت اس کائنات میں فرشتوں کی ہے۔ حضرت میکائیل روزی کے کاموں پر متعین ہیں۔ مگر انھیں یہ اختیار کبھی حاصل نہیں ہوا کہ جس کی روزی چاہیں فراخ کر دیں اور جس کی چاہیں نپی تلی کر دیں۔ یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام انسانوں کی جانیں نکالنے کے کام پر متعین ہیں، لیکن وہ جان لینے کے فعل ہی کو کرنے کے

ذمہ دار ہیں۔ انھیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ جس پر چاہیں، موت وارد کردیں اور جسے چاہیں زندگی عطا کردیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام انبیاء کے پاس وحی لانے کے ذمہ دار تھے مگر یہ متعین کرنا اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاتھ میں رہا کہ وہ کس مخصوص انسان کے پاس وحی لے کر جائیں۔ حضرت اسرافیل قیامت کے دن صور پھونکیں گے مگر وہ وقت متعین کرنا جس میں صور پھونکا جائے گا، ان کا کام نہیں۔ اس وقت کی تعیین اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں میں رکھی ہوئی ہے۔ وَقِس عَلٰی ھٰذا۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا جو ایک مسلمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں فرشتوں کی صحیح صحیح حیثیت کو سمجھ کر اس پر قلبی یقین رکھا جائے۔ یعنی اس بات پر قلبی یقین رکھا جائے کہ فرشتے اس کائنات میں خدا کے کارندے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اس سلطنت میں خادم ہیں، بااختیار نہیں۔ انسانوں کے برعکس ان میں برائی کا مادّہ تو نہیں رکھا گیا اسی لیے وہ گناہ کبھی نہیں کرتے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی لحاظ سے بھی الوہیت میں شریک ہیں۔ انسانوں نے بہت بڑی جہالت کی جو اُنھیں بااختیار سمجھنا شروع کردیا۔ اس بنیادی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ فرشتوں کو دیوی، دیوتاؤں کا نام دے کر خدا کی خدائی میں شریک بنالیا گیا۔

مصلحین کی محبت

انسانوں میں شرک پھیلنے کا ایک اور سبب نیک اور صالح لوگوں کی شدید محبت بتایا گیا ہے۔ اگرچہ انسان کے دل میں برائی اور اچھائی، دونوں کا مادّہ رکھ دیا گیا ہے؛ اور بسا اوقات برائی کا مادّہ اُچھل کر اچھائی کے مادّے پر غالب آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان کے دل میں اچھائی اور نیکی کی قدردانی موجود ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ نیکوکار انسان سے لوگ خواہ مخواہ محبت کرنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو چکا ہو، وہ نیکوکاری اور اچھائی کے لیے کشش ضرور محسوس کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیکی بذاتِ خود حسن ہے جو انسانی دل پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔

چناں چہ وہ نیک لوگ جنھوں نے بڑی راست بازی کی زندگیاں گزاریں اور جب تک جیتے رہے، بنی نوعِ انسان کی بھلائی چاہتے رہے۔ انھیں زندگی میں بھی انسانوں سے محبت ملی اور موت

کے بعد تو ان کے قدر دانوں کے دلوں میں ان کی محبت اور بھی بڑھ گئی۔ یہ محبت آنے والی نسلوں نے ورثے میں پائی۔ جنھوں نے ان مصلحین کو آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ ان نسلوں تک پہنچ کر یہ محبت محبوبوں کے نادیدہ ہونے کے باعث اور بھی گہرا رنگ اختیار کر گئی۔ پھر جہالت کے باعث لوگوں نے ان محبوب ہستیوں کی شبیہیں بنائیں اور ان کے آگے اظہارِ محبت و عقیدت کیا۔ یہی مبالغہ آمیز اظہارِ محبت آہستہ آہستہ پوجاپاٹ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔

اس رائے میں بھی بہت کچھ صداقت محسوس ہوتی ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ اور نیکوکار بزرگ جنھوں نے زندگی بھر شرک کے خلاف جدّوجہد کی، جب وہ دُنیا سے تشریف لے گئے تو محبت ہی کی شدّت کے باعث لوگوں نے انہی شرک کی بیخ کنی کرنے والے بزرگوں کے مزارات کو ذریعہ شرک بنایا۔ بقول کسے، ان مصلحین نے زندگی میں شرک کی بیخ کنی کرنے اور توحید کو پھیلانے کے سلسلے میں اتنی خدمات سرانجام دیں کہ شیطان سخت ناراض ہوا، اور اس نے زبانِ حال سے انھیں دھمکی دی کہ جس طرح تم لوگوں نے زندگی بھر مجھے دُکھ پہنچایا، تمہیں بھی ستاؤں گا، اور تمہارے دنیا سے گزرنے کے بعد تمھیں کو شرک کا مسکن اور گہوارہ بنا کر چھوڑوں گا۔ چناں چہ ایسے ہی ہوا، اور نادان عاشقوں نے ان توحید کے علمبرداروں کی قبروں کو ذریعہ شرک بنالیا۔

نیکی اور نیکوکاری سے محبت رکھنا ایک مومن کے لیے قدرتی امر ہے، اور ہمیں نیکوکاروں سے محبت ہونی ہی چاہیے۔ لیکن یہاں بھی اس بنیادی شے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ نیکی کی کوئی انتہا بھی انسان کو انسانیت کے درجے سے بلند کر کے اولوہیت کے درجے میں داخل نہیں کر سکتی۔ مصلحین سے لازماً محبت ہونی چاہیے۔ لیکن انہیں حاجت روا سمجھ لینا خود انہیں بزرگوں کے مشن کو ناکام بنانے میں مدد دینا ہے۔

کچھ دوسرے اسباب

ایسے ہی شرک پھیلنے کے کچھ دوسرے اسباب بھی بتائے جاتے ہیں۔ مثلاً انسان نے اپنے دورِ جہالت میں جس مظہر کائنات کو بھی ہیبت ناک یا طاقتور سمجھا، اسے معبود مان لیا۔ چناں چہ جنوں کی پرستش کی گئی۔ چاند، سورج، ستاروں، سیاروں کے آگے سر جھکائے گئے۔ سمندروں اور

طوفانوں سے انسان لرزہ براندام ہو گیا۔ طاقت اور ہیبت رکھنے کے علاوہ جن مخلوقات کو زیادہ مفید پایا گیا، انہیں بھی دیوی دیوتا مان لیا گیا۔ مثلاً دُنیا میں کئی اقوام نے گائے کو مقدس مانا اور اب بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو اسے "ماتا" قرار دے کر اسے پوجتے ہیں۔

شرک کی جو قسم بھی ہو، اس کی تہ میں جہالت ہی جہالت کار فرما ہوتی ہے۔ علم اور شرک کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ رسول مقبول ﷺ کے زیر تربیت رہنے کے باعث صحابہ کرام شرک کے بارے میں اتنے حساس ہو گئے تھے کہ اگر کسی معاملے میں ذرا سا بھی شک پڑ جاتا کہ آگے چل کر یہ چیز شرک کا باعث بن جائے گی تو اس کی بیخ کنی کر دیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بات کی اطلاع ملی کہ کچھ لوگ اس درخت کے پاس آکر بڑی عقیدت سے نمازیں پڑھتے ہیں جس کے نیچے حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے بیعت لی تھی۔ یہ سن کر آپ غصے میں آ گئے، لوگوں کو سخت سست کہا اور حکم دیا کہ اس درخت کو فوراً کاٹ دیا جائے۔ (ابن سعد)

حضرت عابس بن ربیعہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حجرِ اسود کو چومتے دیکھا۔ وہ حجرِ اسود کو چومتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے:

"ارے او پتھر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو صرف ایک پتھر ہے؛ نہ نفع دے سکتا ہے، نہ نقصان۔ اگر میں نے خدا کے رسول ﷺ کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز نہ چومتا!" (بخاری، مسلم)

حضرت میمون بن مہران ایک عورت کے غلام تھے۔ آزاد ہونے پر، اپنے علم و فضل کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ آپ کو معصیت اور شرک میں مبتلا ہونا سخت ناگوار گزرتا تھا۔ لوگ آپ کی نیکوکاری کے باعث آپ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ ایک دن ایک چاہنے والے نے جوشِ محبت میں آکر کہہ دیا:

"ابو ایوب! حقیقت یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ رکھے گا، لوگ بھلائی پر قائم رہیں گے!"

حضرت میمون یہ بات برداشت نہ کر سکے اور بول اُٹھے:

"یہ بڑی غلط بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ اس وقت تک بھلائی پر قائم

رہیں گے جب تک اپنے پروردگار سے ڈرتے رہیں گے!"

حضرت میمون فرمایا کرتے تھے کہ توحید اس وقت تک توحید نہیں جب تک انسان شرک کی کامل نفی کر کے اس سے واقعی بے نیاز نہ ہو جائے۔

شرک، ربّ غفور کی غیرت کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بزرگ کی مجلس میں ایک خاتون نقاب اوڑھے آئیں اور ان سے عرض کیا کہ میرا شوہر دوسری شادی کرنے کے درپے ہے۔ آپ اسے ایسا کرنے سے روکیں۔ بزرگ نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ "بی بی! میں بھلا اسے کیسے روک سکتا ہوں۔" خاتون نے کہا: "حضرت! اگر میں اپنا نقاب اُٹھا کر آپ کو اپنی صورت دکھا سکوں تو آپ جانیں کہ میں اپنے مطالبے میں حق بجانب ہوں۔" بزرگ نے پوچھا: "وہ کیسے؟" خاتون نے کہا: "میں اس قدر خوبصورت ہوں کہ مجھ جیسی حسین عورت کا کوئی شریک نہیں ہونا چاہیے۔"

بزرگ یہ سن کر شدّتِ تاثر سے بے ہوش ہو گئے۔ جب وہ ہوش میں آئے تو لوگوں نے اس طرح بے حال ہونے کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب اس خاتون نے کہا کہ میں اس قدر خوبصورت ہوں کہ مجھ جیسی عورت کا کوئی شریک نہیں ہونا چاہیے تو مجھے نیلے آسمان کے ورے سے ایک آواز یہ کہتی ہوئی محسوس ہوئی کہ:

"ذرا اس عورت کو دیکھو کہ محض اس لیے کہ ہم نے کچھ حسن اسے عطا کر دیا ہے، اپنا شریک گوارا نہیں کرتی۔ اگر یہ معمولی حسن کی مالک ہوتے ہوئے بھی شریک سے اس درجہ متنفر ہے تو پھر ہم جو حسن کے خالق ہیں، آخر ہم شریک کو کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔"؟

اللہ سے اور اللہ کے لیے محبت

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت انسانی محبتوں کی نفی نہیں کرتی، بلکہ ان کے لیے ایک مقصد معین کر کے انہیں زیادہ پائیدار بناتی اور افراط و تفریط سے بچاتی ہے۔ رسول مقبول ﷺ کی کئی احادیث اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ جو انسان کسی دوسرے انسان سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہے وہ خدا کی رضا سے سرفراز ہوتا ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کو صرف خدا کی خوشنودی کے لیے چاہے گا تو ظاہر ہے کہ وہ غلط قسم کے انسان کو کبھی نہیں چاہے گا۔ ایسے ہی جب کسی انسان کو چاہت دینے سے مراد رضائے الٰہی ہی ہو، تو ظاہر ہے کہ وہ چاہت انسان پرستی کی حد تک کبھی نہیں پہنچے گی کسی انسان کو صرف اسی کی خاطر چاہنے میں اور انسان کو خدا کی خاطر چاہنے میں، زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ احادیث واضح کرتی ہیں کہ انسان کو خدا کی خاطر چاہنا ایک عظیم نیکی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن بہت سے انبیاء اور شہداء ان کے خاص مقامِ قرب کی وجہ سے ان پر رشک کریں گے۔"

صحابہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! ہمیں بتا دیجیے کہ وہ کون بندے ہیں؟" آپ نے فرمایا:

"یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے بغیر کسی رشتے اور قرابت کے اور بغیر کسی مالی لین دین کے، محض خوشنودیٔ رب کی وجہ سے باہم محبت کی۔ پس قسم ہے خدا کی، ان کے چہرے قیامت کے دن نورانی ہوں گے بلکہ سراپا نور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور عام انسانوں کو جس وقت خوف و ہراس ہوگا، اس وقت وہ بے خوف اور مطمئن ہوں گے اور جس وقت عام انسان مبتلائے غم ہوں گے، وہ اس وقت بے غم

ہوں گے اور اس موقع پر آپ نے یہ آیت پڑھی:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

”معلوم ہونا چاہیے کہ جو اللہ کے دوست اور اس سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں، ان کو خوف و غم نہ ہوگا۔“ (سنن ابی داوٗد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ بندے جو میری عظمت و جلال کی وجہ سے آپس میں اُلفت و محبت رکھتے تھے۔ آج جب میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے۔ میں اپنے ان بندوں کو اپنے سائے میں جگہ دوں گا! (مسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میری محبت واجب ہے ان لوگوں کے لیے جو میری وجہ سے باہم محبت کریں اور میری وجہ سے اور میرے تعلق سے کہیں جڑ کر بیٹھیں اور میری وجہ سے باہم ملاقات کریں اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کریں! (موطا امام مالک)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی گئیں اس نے ان کے باعث ایمان کی مٹھاس پالی۔ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول سے اسے سب سے زیادہ محبت ہو، یہ کہ وہ کسی سے محبت کرے تو خدا کے لیے کرے اور یہ کہ خدا نے اسے کفر سے نجات دی، تو پھر وہ دوبارہ کفر میں واپس جانے کو ایسے ہی ناپسند کرے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو! (بخاری، مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے دوست سے دشمنی کی تو اس کو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے، اگر میرا بندہ فرض کی ادائیگی کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے تو مجھے اس سے زیادہ محبوب اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اور جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرّب چاہتا ہے تو میں بھی اس کو محبوب رکھتا ہوں؛ اور جب میں اسے محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے؛ اور اس کی بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے (کچھ) مانگتا ہے تو اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر

وہ کسی سے پناہ چاہے تو اسے پناہ بھی ضرور عطا کرتا ہوں۔(بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص اپنے ایک بھائی سے جو ایک دوسری بستی میں رہتا تھا، ملاقات کے لیے چلا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی راہ گزر پر ایک فرشتے کو منتظر بنا کر بٹھا دیا (جب وہ شخص اس مقام سے گزرا تو) فرشتے نے اس سے پوچھا: "تمہارا کہاں کا ارادہ ہے؟" اس نے کہا: "میں اس بستی میں رہنے والے اپنے ایک بھائی سے ملنے جا رہا ہوں!" فرشتے نے کہا: "کیا اس پر تمہارا کوئی احسان ہے اور کوئی حق نعمت ہے جسے تم پورا اور پختہ کرنے جا رہے ہو؟" اس بندے نے کہا: "نہیں، میرے جانے کا باعث اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے لیے مجھے اس بھائی سے محبت ہے!" فرشتے نے کہا: "میں تمھیں بتاتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس یہ بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے جیسے تم اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے اس بندے سے محبت کرتے ہو!" (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے راویت ہے کہ رسولِ مقبول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ مہربان ہے اور تمام امور میں مہربانی کو پسند کرتا ہے! (بخاری، مسلم)

غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ انسان کو خدا کے لیے چاہنا در حقیقت خدا ہی کو چاہنا ہے جس کی فضیلت پر قرآن و حدیث گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔

"اور ایمان والے تو اللہ کو شدّت سے چاہتے ہیں۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدو نے رسولِ خدا ﷺ سے دریافت کیا کہ قیامت کب ہوگی؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ بدو نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت! آپ نے فرمایا کہ تم اس کے ساتھ ہو گے جس سے تم نے محبت کی! (بخاری، مسلم)

صحیح روایتوں میں آیا ہے کہ رسولِ خدا ﷺ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ آپ کے پاؤں مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے عرض کیا: "یارسول اللہ! آپ کی مغفرت تو خدا کر چکا ہے، آپ اتنی زحمت کیوں اُٹھاتے ہیں؟" اس پر آپؐ نے فرمایا: "کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں!"

صحابہ نے شاید یہ سمجھا کہ حضور ﷺ کا بہت زیادہ عبادت کرنا بخشش حاصل کرنے کے لیے ہے، چناں چہ انھوں نے تعجب کیا کہ بخشش جب ہو چکی ہے تو پھر حضورؐ اتنی تکلیف کیوں اُٹھاتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ان کے اس خیال کی اصلاح فرمادی اور واضح کر دیا کہ عبادتِ شاقہ خوف کے باعث نہیں بلکہ محبت الٰہی کے باعث تھی۔

حضور ﷺ محبت الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپؐ نے صحابہؓ کے مجمع میں خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

"میں خدا کے سامنے اس بات سے براٴت کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا دوست ہو۔ کیوں کہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنالیا تھا، جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو اس نے اپنا دوست بنالیا تھا!"

وفات کے وقت زبانِ مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا، یہ تھا:

"خدایا! صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہے!" (رفیق اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ)

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

"اب آپ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے؟" (بخاری)

اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندوں نے بھی حب الٰہی کے متعلق بہت کچھ فرمایا:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "مبارک ہے وہ شخص جس کے دل میں خدا کی محبت کے سوا کسی اور کی محبت نہ ہو اور وہ اس کے سوا کسی اور کا طالب نہ ہو۔ پس ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اگرچہ ظاہر میں خلق کے ساتھ مشغول ہے!"

خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ "مجھے نصیحت کیجیے!" انھوں نے فرمایا: "جہاں کہیں ہو، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کرو۔ اللہ تعالیٰ دُنیا والوں سے تمہاری تعظیم کرائے گا!"

جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن کا ارشاد ہے کہ: "دل میں اگر محبت ہو گی تو محبت کا بوّاب (دربان) شکوک کو اندر نہیں گھسنے دے گا!"۔ اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ حجرے کے اندر کئی سوراخ ہیں۔ کہیں چوہے کا اور کہیں کنسلاہز اراپا کا۔ پھر تاریکی بھی ہو اندریں حالات کس طرح ہر سوراخ کو بند کرے گا۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس حجرے میں روشنی کر دی جائے۔ سب موذی جانور غائب ہو جائیں گے۔ اسی طرح اپنے گھر یعنی خانۂ قلب کو محبت الٰہی کی روشنی سے منور

کیا جائے تو انشاء اللہ تمام قلبی امراض سے نجات مل جائے گی! آپ ہی کا ارشاد یہ بھی ہے کہ عظمت و محبت دو ۲ دربان ہیں جو شکوک و شبہات کو اندر نہیں آنے دیتے۔ نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے سے محبتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ:

"حصولِ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ ہر نیک عمل میں آدمی یہ نیت کرے کہ اس سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہو گی۔ نیز کچھ وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی کرے....."

آپ ہی کا یہ مقولہ بھی ہے کہ خوف اور محبت، دو سڑکیں ہیں سلوک الیٰ اللہ کی طرف۔ نیز فرمایا کہ:

"معصیت کر کے انسان اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ انسان کے نقصان پر خفا ہونے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت پائی جاتی ہے اور رحمت کی سوچ و فکر سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے عمل کی توفیق ہوتی ہے اور عمل سے قرب اور رضائے حق جیسی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب محبت ہوتی ہے تو محبوب کے کوچے سے، اس کے کتے سے اور اس کی دیواروں سے بھی محبت ہوتی ہے۔

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ جتنی محبت قوی ہوتی ہے، اسی قدر اطاعت کا حق ادا کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جو دل خدا کی محبت سے غنی ہو، دُنیا کا نہ ہونا اُسے محتاج نہیں کرتا اور نہ اس کے ہونے سے وہ خوش ہوتا ہے۔

یحییٰ بن معاذ صوفی کا فرمان ہے:

"تو جس قدر خدا سے ڈرے گا، خلق اسی قدر تجھ سے ڈرے گی اور تو جس قدر اللہ میں مشغول رہے گا خلق اسی قدر تجھ میں (یعنی تیری خدمت میں) مشغول رہے گی!"

انہی کا یہ قول بھی ہے کہ:

"جو شخص اللہ کی خدمت کر کے خوش ہوتا ہے، خلق اس کی خدمت کر کے خوش ہوتی ہے!"

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور فرمان ہے کہ:

"ہر شخص کی قیمت معرفتِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ جس کو معرفتِ الٰہی حاصل نہ ہو اس کی کوئی قیمت نہیں!"

ابو علی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اے شخص! اپنا دل اپنے خالق کو دے اور اپنا جسم مخلوق کی خدمت کے لیے وقف کر!"

مولانا رُوم حبِّ الٰہی کو دل کی تمام بیماریوں کا علاج بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

خشیتِ الٰہی

محبت کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ ایک محبت تو وہ ہوتی ہے، جس کے ساتھ دل میں محبوب کا خوف موجود نہیں ہوتا اور دوسری محبت وہ ہوتی ہے کہ جتنی محبت ہے اتنا ہی خوف موجود ہے۔ واضح رہے کہ حب الٰہی اس دوسری قسم کی محبت ہوتی ہے، محبت کی انتہائی شدّت کے ساتھ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف بھی پوری شدّت سے موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو چاہنے والوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے محبت بھرے دل محبوب کے خوف سے پوری طرح بھرپور رہتے تھے۔

صحابہ کرامؓ سے زیادہ خدا کی محبت کن لوگوں میں ہو سکتی ہے لیکن ان پاکبازوں کی خشیت کا یہ عالم تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ کے خطبات اور مواعظ سنتے یا قرآن کی تلاوت کرتے اور کوئی خشیت الٰہی کا موقع آجاتا تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

"جو کچھ میں جانتا ہوں، اگر تم جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ؛ تو تمام صحابہؓ بے اختیار رونے لگے!" (بخاری)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جب قرآن مجید کی یہ آیت پڑھتے:

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ . . .:

(الحدید:۱۶)

(کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں . . .)

تو بے اختیار رو پڑتے اور دیر تک روتے رہتے تھے۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "اگر کسی کے دل میں رائی کے برابر بھی غرور ہوگا تو

وہ مرنے کے بعد دوزخ میں ہوگا۔"

حضرت عبداللہ بن قیس انصاریؓ یہ سن کر رو پڑے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "کیوں روتے ہو؟" وہ بولے: "آپ کا ارشاد سن کر!" اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "تمہیں خوشخبری ہو کہ تم جنتی ہو!" (اسد الغابہ)

ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت پڑھتے سنا:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ ..." (النساء : ۴۱)

"اس دن لوگوں کا کیا حال ہو گا جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ لائیں گے ..."

تو زار و قطار رونے لگے۔

صحابہؓ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خاص طور پر رقیق القلب تھے۔ جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو رونے لگتے۔

کلامِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ انسانوں کو اپنا خوف یاد دلایا ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۳۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

"... وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝

(آل عمران:۳۰)

"... اور اللہ تم کو اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔"

سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

"... وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (بقرہ: ۲۰۳)

"... اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

"... وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ط (بقرہ : ۲۲۳)

"... اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تم اس سے ملنے والے ہو۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (بقرہ: ۲۳۱)

"... اور اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرۃ : ۲۳۳)

"... اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞ (المائدة : ۲)

"... اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔"

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۞ (المائده : ۴)

"... اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو، اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞ (المائده : ۷)

"... اور اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۞ (المائده : ۸)

"... اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۞ (المائده :۱۱)

"... اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىٓ أَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۞ (المائده : ۸۸)

"... اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔"

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞

(المائده:۱۰۸)

"... اللہ سے ڈرو اور سنو، اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

یہ تو چند آیات ہیں۔ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ جگہ جگہ انسانوں کو اپنے آپ سے ڈراتا ہے تاکہ وہ پاک اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کر کے دُنیا میں بھی سکھی رہیں اور آخرت میں بھی!

کلام پاک کے علاوہ جب ہم حضور ﷺ کے مواعظ اور نصائح کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں بار بار خشیتِ الٰہی کا درس ہی ملتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (ان فرشتوں کو جو دوزخ پر مقرر ہوں گے) حکم دے گا کہ جس شخص نے مجھے کبھی یاد کیا یا کسی موقع پر جو بندہ مجھ سے ڈرا، اس کو دوزخ

سے نکال لیا جائے!"

جن دلوں میں واقعی اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہوتا ہے، ان کے لیے یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ کبھی خرابی کریں تبھی خدا سے ڈریں؛ بلکہ وہ نیکیاں کرتے ہوئے بھی لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ پتا نہیں، ہمارے یہ اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور میں مقبول بھی ہیں یا نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے قرآن مجید کی آیت:

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَ قُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ۝ (المومنون: ۶۰) (اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔) کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں۔!

آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے صدیق کی بیٹی! نہیں، بلکہ یہ تو اللہ کے وہ خدا ترس بندے ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی یہ عبادتیں قبول نہ کی جائیں۔ یہی لوگ بھلائیوں کی طرف تیزی سے دوڑتے ہیں!" (ترمذی، ابن ماجہ)

جو پاکباز لوگ اس طرح نیکی کرتے ہوئے بھی خدا سے ڈرتے رہتے ہیں، ان کے بارے میں آسانی سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے گناہوں سے تو بہت ہی دُور رہیں گے، جیسا کہ ترمذی کی مندرجہ بالا حدیث سے پتہ چلتا ہے۔ خشیت الٰہی انسان کے لیے بخشش کا باعث بن جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"اگر اللہ کے خوف اور ہیبت سے بندۂ مومن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکل پڑیں اگرچہ وہ مقدار میں بہت کم، مثلاً مکھی کے سر کے برابر ہوں؛ پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس چہرے کو آتش دوزخ کے لیے حرام کردے گا۔" (سنن ابن ماجہ)

صحیح بخاری میں خدا سے ڈرنے والے کے بارے میں ایک بڑی ہی دل پذیر روایت بیان

ہوئی ہے، جس سے ایک طرف تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العالمین اپنے بندوں پر کس درجہ مہربان اور شفقت فرمانے والا ہے اور دوسری طرف، خشیتِ الٰہی رکھنے والے دلوں کی فضیلت کا حال معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنے نفس پر بڑی زیادتی کی (یعنی زندگی میں بہت گناہ کیے) جب موت کا وقت آیا تو (اس کے دل میں خدا کے خوف کا بہت غلبہ ہوا اور) اس نے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو تم مجھے جلا کر راکھ کر دینا۔ پھر تم میری اس راکھ میں سے آدھی کو کہیں خشکی میں بکھیر دینا اور آدھی کہیں دریا میں بہا دینا (تاکہ میرا کہیں پتہ نشان بھی نہ رہے اور میں جزا و سزا کے لیے دوبارہ زندہ نہ کیا جاؤں۔ اس نے کہا کہ میں ایسا گنہگار ہوں کہ) اللہ کی قسم! اگر خدا نے مجھے پکڑ لیا تو وہ مجھے ایسا سخت عذاب دے گا جو دُنیا جہان میں کسی کو بھی نہ دے گا!

اس کے بعد جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے خشکی اور تری سے اس کے اجزا جمع کیے گئے (اور اس کو دوبارہ زندہ کیا گیا)۔ پھر اس سے پوچھا گیا کہ: "تو نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے عرض کیا: "اے میرے مالک! تو خوب جانتا ہے کہ تیرے ڈر ہی سے میں نے ایسا کیا تھا!" (حضور ﷺ نے یہ واقعہ بیان کر کے ارشاد فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں پیدا ہونے والے خوفِ خدا کے باعث اس بندے کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"تم کو اپنی ذات سے نہ کسی گورے کے مقابلے میں بڑائی حاصل ہے نہ کسی کالے کے مقابلے میں۔ البتہ تقویٰ (یعنی خوفِ خدا) کی وجہ سے تم کسی کے مقابلے میں بڑے ہو سکتے ہو۔" (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسولِ خدا ﷺ سے عرض کیا کہ: "یارسول اللہ! آپ پر بڑھاپا آ گیا!" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھے بوڑھا کر دیا سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلٰت، سورۂ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ اور سورۂ تکویر نے!" (ترمذی)

قرآن مجید کی ان سورتوں میں قیامت، آخرت اور مجرموں پر عذاب کا بڑا دہشت ناک

بیان ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے دل میں خوفِ خدا اس قدر زیادہ تھا کہ جب تیز ہوا چلتی تو آپ ﷺ اس خیال سے خوف زدہ ہو جاتے کہ ایسی تیز ہوائیں اور آندھیاں پچھلی قوموں پر عذاب لاتی تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا حال یہ تھا کہ جب تیز ہوا چلتی تو آپ کی زبان پر یہ دُعا جاری ہو جاتی:

"اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس کی بھلائی کا اور اس میں جو کچھ ہے اس کی بھلائی کا اور جس مقصد کے لیے یہ بھیجی گئی ہے، اس کی بھلائی کا اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس کے شر سے اور اس میں جو کچھ ہے، اس کے شر سے اور جس مقصد کے لیے یہ بھیجی گئی ہے اس کے شر سے۔"

اور جب آسمان پر اَبر آتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا اور (اضطراب کے باعث) کبھی باہر آتے، کبھی اندر جاتے، کبھی پیچھے ہٹتے۔ پھر جب بارش ہو جاتی (اور خیریت سے گزر جاتی) تو یہ کیفیت آپ ﷺ سے دُور ہو جاتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کی اس حالت اور واردات کو سمجھ لیا۔ آپؐ سے پوچھا کہ تیز ہوا اور ابر کو دیکھ کر آپؐ کی یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"عائشہؓ! (میں ڈرتا ہوں) کہ شاید یہ ابر و باد اسی طرح کا ہو جو (حضرت ہود پیغمبر کی قوم) عاد کی طرف بھیجا گیا تھا۔ جب ان لوگوں نے اس بادل کو اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو (خوشی ظاہر کرتے ہوئے) کہا کہ یہ اَبر ہمارے لیے بارش لانے والا ہے (حالانکہ وہ ہلاکت لے کر آیا تھا) (بخاری، مسلم)

دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا یا نہ ہونا، علامت ہے اس بات کی کہ دلوں میں ایمان مضبوط ہے یا کمزور۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین چوں کہ بہترین ایمان دار لوگ تھے، اس لیے ان کے دلوں میں خدا کا خوف بھی بہت گہرا تھا۔

رسولِ خدا ﷺ کی وفات کے بعد حضرت انسؓ نے اپنے زمانے کے لوگوں سے فرمایا:

"تم لوگ بہت سے اعمال ایسے کرتے ہو کہ تمہاری نگاہوں میں وہ بال سے بھی زیادہ باریک ہیں۔ (یعنی بہت ہی حقیر اور ہلکے ہیں) مگر ہم رسولِ خدا ﷺ کے

زمانے میں انہیں مہلکات میں شمار کرتے تھے!" (بخاری)

بنی نوعِ انسان کے غم والم، دُکھوں، بے چینیوں اور قلبی اور جسمانی اذیتوں کا بہت بڑا حصہ ان برائیوں کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتا ہے جن کا انسان ارتکاب کرتا ہے۔ چور کے چوری کرنے سے، ڈاکو کے ڈاکہ ڈالنے سے، قاتل کے قتل کرنے سے، ہمسائے کے ہمسائے کو ستانے سے، رشتہ دار کے رشتہ داروں سے عداوت، کینہ اور دُشمنی رکھنے سے، بدکردار انسانوں کی بدکرداریوں سے اور غدّاروں کے ملک و ملت کے ساتھ غدّاری کرنے سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ متأثر ہوتے اور طرح طرح کی جسمانی، ذہنی اور قلبی اذیتوں اور رُسوائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کوئی اپنا سرمایہ کھو بیٹھتا ہے، کوئی گھر سے بے گھر ہو جاتا ہے، کوئی فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، کسی کا جینا اجیرن ہو جاتا ہے۔ کوئی مستقبل اعصابی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ بے شمار ایسے ہیں جو غم والم کی تاب نہ لاتے ہوئے پاگل ہو جاتے ہیں۔ ان گنت ایسے ہیں جو اپنی عزّت و آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور کروڑوں کی آبادیاں رکھنے والی قومیں صدیوں کے لیے غلامی اور رُسوائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

انسانیت کے سینے پر یہ گھاؤ خود انسانوں ہی کے ہاتھوں پڑتے ہیں اور اسی لیے پڑتے ہیں کہ انسانوں کے دلوں میں خدا کا خوف موجود نہیں ہوتا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس تناسب سے انسانوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہوتا جاتا ہے، اسی تناسب سے یہ اذیتیں اور کلفتیں کم ہوتی ہیں اور جس تناسب سے انسان کے دل سے خدا کا خوف نکلتا جاتا ہے، اسی تناسب سے اس کے مصائب اور رُسوائیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

خوفِ خدا کے بارے میں ایک بہت ضروری بات یہ ہے کہ یہ خوف ٹھیک اسی قسم کا خوف ہو جو انبیائے کرام اور مصلحین کے دلوں میں تھا۔ یعنی دلوں میں اُمید اور خوف دونوں کے درمیان اعتدال رہے۔ خوف کی وہ انتہا جو بخشش کی اُمید کو بالکل ختم کر دے، ہرگز مطلوب نہیں۔ یہ خوف مریضانہ ہے۔ مومن کے دل کا خوف مریضانہ نہیں، صحت مندانہ ہوتا ہے۔ وہ خدا کے خوف کے باعث گناہوں سے بچنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے مگر ساتھ ہی اسے خدا کی رحمت پر بھروسہ ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ:

اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔

”ایمان خوف اور اُمید کے درمیان ہوتا ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مندرجہ ذیل بیان اسی خوف اور امید کے درمیان اعتدال کی عکاسی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

”اگر خدا تعالیٰ کا حکم صادر ہو کہ ساری مخلوق میں سے صرف ایک آدمی جنت میں جائے گا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ آدمی میں ہوں گا اور اگر یہ فرمان صادر ہو کہ دوزخ میں صرف ایک ہی شخص داخل ہو گا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص کہیں میں ہی نہ ہوں!“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات ہیں:

”جو خدا سے ڈرتا ہے، خدا اس کی مشکلات آسان کر دیتا ہے۔“

”جو شخص خدا سے ڈرتا ہے، اس کو وہاں سے فائدہ پہنچتا ہے جہاں اس کا وہم و گمان بھی نہیں جاتا۔“

”جو انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے قصور بھی معاف کر دیتا ہے اور اسے اچھا انعام بھی دیتا ہے۔“

نیز آپؓ نے فرمایا:

”یقیناً یہ انسانوں کے لیے بہترین کام ہے کہ وہ ایک دوسرے کو خوفِ خدا کی تلقین کرتے رہیں۔“

رضائے الٰہی

حضرت ابن نجید رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم گزرے ہیں۔ آپ بہت نیکوکار اور عبادت گزار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دولت اور ثروت بھی بہت دے رکھی تھی جو کثرت سے راہِ خدا میں صرف ہوتی رہتی تھی۔

حضرت ابن نجید کے استاد کا نام ابو عثمان تھا۔ ایک دفعہ ابو عثمان نے سرحد پر لڑنے والے مجاہدوں کے لیے چندے کی اپیل کی۔ اپیل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور بہت کم چندہ ہوا۔ ایک دن جب بہت سے لوگ ابو عثمان کے پاس بیٹھے تھے۔ ابو عثمان مجاہدین کی بھوک پیاس اور تکالیف کو یاد کر کے زور زور سے رونے لگے۔ ابن نجید پر بہت اثر ہوا اور گھر سے دو ہزار کی تھیلی لا کر مجاہدین کے لیے نذر کر دی۔ ابو عثمان بہت خوش ہوئے اور سب کے سامنے ابن نجید کی تعریف کی تاکہ دوسرے لوگوں میں بھی اس نیکی کا شوق پیدا ہو۔

ابن نجید نے جب لوگوں کے سامنے اپنی تعریف ہوتی دیکھی تو سب کے سامنے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں یہ رقم اپنی والدہ کے مشورہ کے بغیر لے آیا ہوں پتہ نہیں وہ اتنی بڑی رقم دینے کے لیے آمادہ بھی ہوں یا نہ۔ آپ یہ رقم مجھے واپس کر دیجیے ابو عثمان نے چپ چاپ رقم واپس کر دی اور ابن نجید سب کے سامنے یہ رقم لے کر واپس گھر چلے گئے۔

جب رات ہو گئی اور ابن نجید نے سمجھا کہ اب ابو عثمانؒ اکیلے ہوں گے تو تھیلی اُٹھا کر پھر پہنچے اور رقم استاد کے حوالہ کر کے کہا کہ:

> ”حضرت! میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے اس عمل کی خبر لوگوں کو ہو۔ میں لوگوں کی تعریف سے بے نیاز ہو کر صرف خدا کی خوشنودی چاہتا ہوں۔ اس لیے آپ خدا کے لیے کسی کو اس کی خبر نہ کریں۔“

حب الٰہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ جو بھی نیکی کی جائے، صرف محبوب کی خوشنودی کو

مد نظر رکھ کر کی جائے۔ اس کے سوا کسی اور کی خوشنودی مقصود نہ ہو۔

کلامِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْراً عَظِيْماً۝ (النساء : ۱۱۴)

"... اور جو کوئی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا، ہم اسے بڑا اجر عطا فرمائیں گے!"

نیکی در حقیقت ہے ہی اس کا نام جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ جس عمل سے خدا کے سوا کسی اور کی خوشنودی یا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی واہ واہ مراد ہو، در حقیقت نیکی ہے ہی نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بیان کی گئی ہے جو اس بات کی پوری وضاحت کرتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے فرمایا:

"سب سے پہلا شخص جس کے خلاف قیامت کے دن عدالتِ خداوندی سے (دوزخ میں ڈالے جانے کا) فیصلہ دیا جائے گا وہ ایک (ایسا) آدمی ہو گا جو شہید کیا گیا ہو گا۔ یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا تعالیٰ اُسے بتائے گا کہ میں نے تمہیں یہ اور یہ نعمتیں دی تھیں۔ وہ شخص خدا کی ان نعمتوں کا اقرار کرے گا پھر خدا تعالیٰ اس سے دریافت کرے گا کہ بتاؤ تم نے ان نعمتوں سے کیا کیا کام لیا۔ وہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا۔ (اس پر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نے جہاد میں اس لیے حصہ لیا تھا کہ تیری بہادری کے چرچے ہوں۔ سو، تیرا یہ مقصد حاصل ہو چکا (اور دُنیا میں) تیری بہادری کے چرچے ہو لیے۔ پھر اس کے بارے میں خدا کا حکم ہو گا اور اسے اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص ہو گا جس نے دین کا علم حاصل کیا ہو گا اور دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دی ہو گی اور قرآن بھی خوب پڑھا ہو گا۔ اس کو بھی خدا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی عطا کی ہوئی نعمتیں بتائے گا۔ وہ شخص سب نعمتوں کا اقرار کرے گا پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ بتا، تو نے میری ان

نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا، خداوندا! میں نے آپ کا علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور آپ ہی کی رضا کے لیے قرآن پڑھتا رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تونے یہ بات جھوٹ کہی۔ تونے علم اس لیے حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے پڑھتا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے۔ چناں چہ تجھے عالم اور قاری کہا گیا۔ پھر اس کے لیے بھی خدا تعالیٰ کا حکم ہوگا اور وہ اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ایک تیسرا شخص ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بھرپور دولت دی ہوگی اور ہر طرح کا مال عطا فرمایا ہوگا۔ وہ بھی خدا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں جتلائے گا (کہ میں نے دنیا میں تجھے یہ اور یہ نعمتیں عطا کرر کھی تھیں)۔ وہ ان سب کا اقرار کرے گا پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تونے میری ان نعمتوں سے کیا کام لیا۔ وہ عرض کرے گا، خداوندا! جس جس راستے میں، جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے، میں نے تیرا دیا ہوا مال تیری رضا جوئی کے لیے ان سب میں خرچ کیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تونے یہ جھوٹ کہا۔ درحقیقت یہ سب کچھ تونے اس لیے کیا تھا کہ دنیا میں تو سخی مشہور ہو۔ چناں چہ تو سخی مشہور ہوگیا۔ پھر خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے بھی حکم ہوگا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹا جائے گا اور دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔"

اس حدیث سے یہ بات بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ اصل شے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اگر کسی نیک عمل سے خدا کی خوشنودی نہیں بلکہ کسی اور کی خوشنودی مراد ہے تو وہ نیکی نہیں بلکہ ریاکاری ہے اور ریاکاری کی، خدا اور خدا کے رسول ﷺ دونوں نے سخت مذمت کی ہے۔

درحقیقت اللہ کے سوا کسی اور کی خوشنودی کو مقصود بنانا ہے ہی نادانی کی بات۔ زندگی میں کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی اپنے ہی جیسے انسان کی خوشنودی چاہنے کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلے جاتے ہیں مگر وہ شخص حسن سلوک کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا نیت پر شک کرنے لگتا ہے۔ یا کسی وقت ذرا سی کمی ہو جانے پر سب اگلے پچھلے احسانات بھلا کر بدسلوکی پر اُتر آتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے درحقیقت انسان پر بہت بڑا انعام فرمایا ہے

کہ اسے احسان فراموش اور طوطا چشم انسانوں کی خوشنودی کا پابند نہیں بنایا بلکہ اپنی رضا کا پابند بنایا ہے اور اس کا تو عالم یہ ہے کہ وہ شاکر اور حلیم ہے۔

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے تعریف کے ساتھ ان انسانوں کا ذکر کیا ہے جو خدا کی خوشنودی کے حصول کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۰۷ میں ارشاد ہوا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیُ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝ (البقرہ : ۲۰۷)

”انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔“

سورۂ الکہف آیت ۲۸ میں فرمایا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ وَ لاَ تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ...“ (الکهف : ۲۸)

”اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔“

سورۂ الدھر آیت ۹ میں نیکوکاروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ جن لوگوں کو وہ فی سبیل اللہ کھانا کھلاتے ہیں، انھیں مخاطب کرکے وہ کہتے ہیں کہ:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لاَ نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّ لاَ شُكُوْراً ۝ (الدھر : ۹)

”ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ“

سورۂ الانعام آیت ۱۶۲ میں رسولِ مقبول ﷺ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا ہے کہ:

قُلْ إِنَّ صَلاَتِي وَ نُسُكِي وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ (الانعام : ۶۲)

”اے نبیؐ! کہو میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔“

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ مقبول ﷺ نے فرمایا کہ بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو اور وہ بغض و عداوت ہے جو اللہ کے لیے ہو! (سنن ابی داوٗد)

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بے حد پسند ہے کہ انسان جب کسی سے محبت کرے، تو اس خیال سے کرے کہ اس انسان کے ساتھ محبت کرنے سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو گی اور ایسے ہی کسی سے بغض بھی اپنی ذاتی نفرت یا دشمنی کے باعث نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ شخص اپنی بداعمالی کے باعث اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے!

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ جس بندے نے بھی اللہ کی (رضا حاصل کرنے) کے لیے کسی سے محبت کی، اس نے اپنے رب عزّوجل ہی کی توقیر کی۔ (مسند احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ خیرات کرنے سے مال میں کمی نہیں ہوتی اور معاف کر دینے سے خدا بندے کی عزت بڑھاتا ہے اور جس نے خدا کی رضاجوئی کے لیے تواضع کی خدا اس کے درجے بلند فرماتا ہے۔ (مسلم)

رسولِ خدا ﷺ کی تعلیمات کے زیرِ اثر صحابۂ کرام کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ہر دم رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جب رسولِ اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک کی شرکت کے لیے منادی کرائی تو حضرت واثلہ بن اسقعؓ تمام مدینے میں پکارتے پھرتے کہ کون اس شخص کو سواری دیتا ہے جو اس کے عوض اسے اپنی غنیمت کا حصہ دینے کے لیے تیار ہے؟ اس پر ایک بوڑھے انصاری نے انہیں سواری دیدی جب مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو حضرت واثلہؓ کے حصے میں چند نوجوان اونٹنیاں آئیں۔ آپ ان اونٹنیوں کو لے کر اس انصاری کے پاس پہنچے تا کہ شرط کے مطابق اونٹنیاں ان کے حوالے کر دیں۔ انصاری نے اونٹنیوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور کہا: "عمدہ ہیں" لیکن انہیں لینے پر تیار نہ ہوئے اور حضرت واثلہؓ سے کہا کہ اپنی اونٹنیاں لے جاؤ ہمارا مقصود تمہارا یہ حصہ نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ آپ کی مراد یہ تھی کہ ہم نے مالِ غنیمت کا حصہ حاصل کرنے کے لیے تمہیں سواری نہیں دی تھی بلکہ جہاد میں شرکت کرنے کا ثواب حاصل کرنے کے لیے دی تھی۔

اسلام نے رضائے الٰہی کو نیک اعمال کا مقصود قرار دے کر انسان کو انسان دوستی کے اعلیٰ

ترین مقام پر پہنچادیا ہے۔ اللہ کی رضا ہی کو پیش نظر رکھنے والا انسان بنی نوعِ انسان کے لیے رحمت بن سکتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی حرص اسے اس بات پر آمادہ کرتی رہتی ہے کہ خدا کی مخلوق کی خدمت اور بھلائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے اور پھر یہ ساری خدمت چوں کہ وہ خدا کے لیے کرتا ہے اس لیے نہ تو وہ ان انسانوں سے، جن پر اس نے احسان کیا ہوتا ہے، کسی عوض کا طلب گار ہوتا ہے اور نہ اپنے احسان جتا جتا کر انھیں شرمندہ اور پریشان کرتا ہے؛ وہ اس بات سے بہت ہی دُور ہوتا ہے کہ اپنے نیک اعمال کا اشتہار دیتا پھرے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی بے دریغ دولت رفاہِ عامہ کے کاموں پر صرف کی اور مصر اور شام کو رفاہِ عامہ کے اداروں، مساجد، مدارس اور سراؤں وغیرہ سے بھر دیا۔ لیکن ان اداروں میں سے کسی کو بھی انھوں نے اپنے نام سے منسوب نہ کیا بلکہ وہ ایسے اداروں کو اپنے فوجی افسروں، وزیروں، مددگاروں اور دوستوں کے نام سے منسوب کیا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ مسجد نبوی میں آئے تو حضرت معاذ بن جبلؓ کو رسولِ مقبول ﷺ کی قبر مبارک کے پاس روتے دیکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے ایک بات رُلا رہی ہے جو میں نے رسولِ خدا ﷺ سے سنی تھی۔ میں نے آپ سے سنا تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے اور جس شخص نے اللہ کے کسی دوست سے دشمنی کی تو اس نے خود اللہ کو دعوتِ جنگ دی اور بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان نیکوکار متقی بندوں سے جو ایسے چھپے ہوئے اور غیر معروف ہوں کہ جب غائب ہوں تو کوئی انھیں تلاش نہ کرے اور حاضر ہوں تو کوئی انھیں دعوت دے کر اپنے پاس نہ بلائے۔ ان کے دل ہدایت کے چراغ سے روشن ہیں کہ نکل جاتے ہیں کالی آندھیوں سے! (سنن ابن ماجہ)

جن نیکوکاروں کا یہاں ذکر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیشہ رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھا اور دنیا میں شہرت اور واہ واہ سے اس حد تک بے نیاز رہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کن خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان غیر معروف اور گمنام انسانوں کے دل ایسے روشن ہیں کہ فتنوں کے سخت سے سخت اندھیروں میں سے بھی وہ اپنے دین اور ایمان کو محفوظ رکھتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقصود قرار دینا جتنا ارفع عمل ہے، ریا یعنی لوگوں کو دکھانے کے لیے

نیکیاں کرنا اتنا ہی قابل مذمت فعل ہے۔ رسولِ مقبول ﷺ نے ریاکاری کی عبادتوں اور ریاکاری کے دوسرے اعمال کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

حضرت شدّاد بن اوس سے روایت ہے کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے سنا کہ "جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ و خیرات کیا اس نے شرک کیا۔" (مسند احمد)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور ﷺ ہماری طرف تشریف لائے۔ اس وقت ہم آپس میں مسیح دجال کا تذکرہ کر رہے تھے، آپؐ نے ہم سے فرمایا: "کیا میں وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟" ہم نے عرض کیا: "حضورؐ ضرور بتلائیں کہ وہ کیا چیز ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "وہ شرک خفی ہے (جس کی مثال یہ ہے) کہ آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو۔ پھر اپنی نماز کو اس لیے لمبی کر دے کہ کوئی آدمی اسے نماز پڑھتے دیکھ رہا ہے۔" (سنن ابن ماجہ)

حضرت محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرکِ اصغر کا ہے۔" بعض صحابہ نے عرض کیا: "یارسول اللہ! شرکِ اصغر کا کیا مطلب؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "ریا" (مسند احمد)

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں کہ میں بچپن میں بڑا عابد، زاہد، شب بیدار تھا۔ ایک رات اپنے والد کے ساتھ مسجد میں مشغول تھا اور قرآن حکیم بغل میں لیے ہوئے تھا۔ کچھ لوگ ہمارے چاروں طرف سو رہے تھے۔ میں نے والد صاحب سے کہا: ان لوگوں میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ اُٹھ کر دو رکعتیں پڑھ لیتا۔ ایسے سوئے ہوئے ہیں گویا مردہ ہیں۔ یہ سن کر میرے والد نے فرمایا: "جانِ پدر! تم بھی اگر سو جاتے تو اس سے بہتر تھا کہ لوگوں کی عیب چینی کرتے۔

ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خط لکھا اور اس میں درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمادیں۔ لیکن بات مختصر اور جامع ہو، بہت زیادہ نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں مندرجہ ذیل خط لکھا:

"سلام ہو تم پر...... اما بعد...... میں نے رسولِ خدا ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جو کوئی اللہ کو راضی کرنا چاہے لوگوں کو خفا کر کے، تو اللہ اسے مستغنی

کردے گا لوگوں کے فکر اور بار برداری سے اور خود اس کے لیے کافی ہو جائے گا اور جو کوئی بندوں کو راضی کرنا چاہے گا اللہ کو ناراض کر کے، تو اللہ اسے لوگوں (ہی) کے سپرد کر دے گا۔ والسلام" (جامع ترمذی)

اس فانی دُنیا میں رہنے والا انسان اگر اپنے ہی جیسے دوسرے فانی انسانوں کی تعریف و توصیف ہی کو مقصود قرار دے لے تو پھر اس سے زیادہ نادان کون ہو گا۔ جب ہم کوئی نیک عمل دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر کتنے لوگ اسے دیکھ سکتے ہیں۔ ان تھوڑے سے لوگوں کی واہ واہ حاصل کرنے کے بعد قیامت کے دن انھیں واہ واہ کرنے والوں اور ان کے علاوہ بے شمار دوسرے لوگوں کے سامنے جو رُسوائی ہو گی، اس کا ابھی سے دھیان کر لینا چاہیے۔

ذکرِ الٰہی

محبت کے تقاضوں میں ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ دل میں محبوب کی یاد قائم رہے اور جس ہستی کی یاد دل میں ہمیشہ رہے گی، کوئی سوال نہیں اُٹھتا کہ اس کا ذکر بار بار زبان پر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بے حد پسند فرمایا ہے کہ اس کی مخلوق اس کا ذکر کرتی رہے دل میں بھی اور زبان سے بھی۔ ذیل کی آیات اس کی وضاحت کرتی ہیں:

سورۂ اعراف آیت ۲۰۵ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَّ خِيفَةً وَّ دُوْنَ الجَهْرِ مِنَ القَوْلِ بِالغُدُوِّ وَالاٰصَالِ وَلاَ تَكُنْ مِّنَ الغٰفِلِيْنَ ۝

(الاعراف: ۲۰۵)

(اور اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کر اپنے دل میں گڑگڑا کر اور چپکے سے اور بغیر آواز بلند کیے؛ اور غافلوں میں نہ ہونا۔)

سورۂ حدید آیت ۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْٓا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الحَقِّ لا (الحدید : ۱۶)

(کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں ...)

سورۂ آلِ عمران آیت ۱۰۳ میں فرمایا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ... (آل عمران : ۱۰۳)

(اور اللہ کی نعمت کو جو تم پر اس نے کی ہے، یاد کرو!...)

سورۂ نور آیت ۳۷ میں ارشاد ہوا ہے:

رِجَالٌ لا لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لاَ بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْماً تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝

(النّور : ۳۷)

((ایسے) لوگ ہیں جنھیں اللہ کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ تجارت غافل کرتی ہے، نہ خرید و فروخت۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی!)

سورۂ الزمر آیت ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(الزمر: ۲۲)

(... سو، ان کے لیے ہلاکت ہے جن کے دل خدا کے ذکر کے تئیں سخت ہیں۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں!)

سورۂ زخرف آیت ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَاناً فَهُوَ لَهُ قَرِيْنٌ ۝

(الزخرف : ۳۶)

(اور جو کوئی رحمٰن کی یاد سے غافل ہوگا، ہم اس پر شیطان مقرر کردیں گے، سو، وہی اس کا ساتھی ہوگا!)

سورۂ الحشر آیت ۱۹ میں بیان ہوا ہے:

وَلاَ تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوْا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (الحشر : ۱۹)

(ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انھیں خود اپنا نفس بھلادیا۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔)

سورۂ المنافقون آیت ۹ میں ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ج وَ مَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (المنٰفقون:۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔)

سورۂ جن آیت ۱۷ میں بیان ہوا ہے:

... وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝

(الجنّ:۱۷)

(اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا، اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔)

سورۂ العنکبوت آیت ۴۵ میں بیان ہوا ہے:

... وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝

(العنکبوت:۴۵)

(... اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو!)

سورۂ بقرہ آیت ۱۵۲ میں بیان ہوا ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝

(البقرہ: ۱۵۲)

(تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔ میرا شکر کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔)

سورۂ انفال آیت ۴۵ میں ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الانفال : ۴۵)

(مسلمانو! جب تم (کافروں کی) جماعت کے بالمقابل ہو تو جمے رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔)

اقسامِ ذکر

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ کبھی یہ ذکر قلبی ہوتا ہے، یعنی دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد قائم رکھی جاتی ہے اور کبھی یہ قولی تو کبھی عملی۔ دل کی یاد بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس

دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد رہے گی، اس میں ناپاک خیالات نہیں آئیں گے۔ قلبی ذکر جتنا ضروری ہے اتنا ہی، اسے آسان کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے وضو کی بھی کوئی شرط نہیں۔ نہ یہ ضروری ہے کہ کسی خاص جگہ بیٹھ کر ہی ذکر کیا جائے۔ بس، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کام دھندا کرتے، اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں موجود رہے۔ یہ یاد، زندگی میں سب سے بڑا ساتھی، سب سے بڑا مددگار اور سب سے بڑا سہارا ہے۔ پریشانیوں کی انتہا کے وقت یہ یاد ہی دل کی ڈھارس بندھاتی اور عمل پر اُبھارتی ہے۔ جو خوش قسمت اس یاد کو دل میں قائم رکھنے میں کامیاب ہوگئے، انھوں نے فلاح و کامیابی کی چابی حاصل کرلی۔

ذکر کی دوسری قسم قولی ذکر ہے، یعنی زبان سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ قولی ذکر میں مختلف چیزیں آجاتی ہیں۔ کلامِ پاک کی تلاوت بھی قولی ذکر کی ایک شکل ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی تلاوت کر رہا ہے، وہ فی الحقیقت اس کی یاد ہی میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور میں دُعا کرنا بھی قولی ذکر کی ایک شکل ہے۔ ان کے علاوہ کچھ پاک کلمات بھی ہیں جنھیں کلماتِ ذکر کہا جاتا ہے۔ مثلاً:

سُبْحَانَ اللّٰہ کہنا، یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہنا، یعنی اسے سب تعریف کا سزاوار قرار دینا۔

اَللّٰہُ اَکْبَرْ کہنا، یعنی اسے سب سے بڑا ماننا۔

لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ کہنا، یعنی یہ اقرار کرنا کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں۔

ایسے ہی اللہ ربّ العالمین کے ۹۹ پاک نام ہیں جن میں سے ہر نام اس کی ایک صفت کو ظاہر کرتا ہے، اس کے ان ناموں کا ورد کرنا بھی قولی ذکر ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دو پیارے بول ہیں جو زبان پر آسان ہیں اور عمل کی ترازو میں بھاری۔ (وہ بول یہ ہیں): سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ (میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اس کی تعریف کے ساتھ۔ میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں جو عظمت والا ہے۔)

ایک اور جگہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

"صبح ہوتی ہے تو انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے۔ ہر بار سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، ہر بار الحمد للہ کہنا صدقہ ہے، ہر بار لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، ہر بار

اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے!" (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

اثنائے معراج میں حضور اکرم ﷺ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے آپؐ سے کہا کہ میری طرف سے اُمت کو سلام کہیں اور یہ پیغام دیں کہ جنت کی مٹی پاکیزہ اور پانی شیریں ہے اور یہ بے سبزہ ہے۔ اس میں 'سبحان اللہ، الحمد للہ، لاَ اِلٰہ اِلاّ اللہ، اور اللہ اکبر، کہنے سے اگاؤ ہوتا ہے۔ (یعنی یہ کلمات پڑھنے سے بہشت کی سرزمین میں سبزہ اُگتا ہے۔ (ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی)

جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن صاحب فرماتے ہیں:

"دُنیا میں ایک دفعہ الحمد للہ کہنا دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے وقت کی قدر کرو اور پیسے کی بھی قدر کرو، بیکار ضائع نہ کرو۔ وقت بڑی قیمتی دولت ہے، اس کو ضائع نہ کرو، تسبیح و تحمید میں رہو!"

نیز آپ نے فرمایا:

"اصل چیز کام کرنا ہے، اس کا موقع دُنیا ہی میں ہے۔ جب رُوح بدن سے نکل جائے گی، پھر کروڑ جتن کرے نہ ملے گی۔ وہ ایسی نعمت ہے جو جنت میں نہ ملے گی اور ایسی نعمت ہے کہ جنت کی نعمتیں بھی جب ہی ملیں گی کہ وہ نعمت دُنیا میں حاصل ہو جائے۔ اس لیے دُنیا بڑی نعمت کی جگہ ہے اور وہ نعمت یہاں سے آسانی سے مل جاتی ہے۔ وہ نعمت ذکرِ الٰہی ہے!"

تفسیر رُوح المعانی میں حضرت سلیمان کا ایک قصہ بیان ہوا ہے کہ انھیں بے نظیر سلطنت عطا کی ہوئی تھی۔ جس وقت ان کا دربار ہوتا تھا تو تختِ شاہی اتنا وسیع ہوتا تھا کہ اس پر سونے چاندی کی چھ لاکھ کرسیاں بچھتی تھیں۔ پرندے اس پر سایہ کرتے اور ہوا کو جاسوسی کا کام سپرد ہوتا کہ رُوئے زمین میں جہاں کہیں ہمارے متعلق کوئی بات کی جائے ہمیں پہنچادو۔ اور جب تخت پر دربار منعقد ہوتا، تو ہوا کو حکم دیا جاتا کہ اس کو لے کر اُڑے۔ چناں چہ ہوا اس کو لے کر اُڑتی تھی۔ ایک دفعہ اسی شان و شوکت سے آپ کا تخت جارہا تھا کہ کسی نے تعجب سے کہا: سُبحَانَ اللّٰہِ مَاذَا اُوتِیَ آل دَاوٗد ۔ (میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں کہ آلِ داؤد کو کیا شان و شوکت دی گئی) حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس شخص کو بلا کر پوچھا کہ ہمارے متعلق کیا کہا؟ وہ پہلے تو ڈرا۔ پھر تسلی دنے

پر بتادیا کہ ایسے کہہ رہا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: تَسْبِیحَةٌ وَاحِدَةٌ خَیْرٌ مِمَّا اُوْتِیَ آلُ دَاوُدَ (ایک دفعہ سبحان اللہ پڑھنا اس شان و شوکت سے بہتر ہے جو آلِ داؤد کو دی گئی)۔

ابو وائل بن سلمہ تابعی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے چار عطیے دیئے اور کہا کہ ایک نعرۂ تکبیر دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے (طبقات ابن سعد)

ذکر کی تیسری قسم عملی ذکر ہے۔ عملی ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل کیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کی یاد کی ایک بڑی اہم شکل ہے۔ در حقیقت یہ تینوں چیزیں اسی طرح قدرتی طور پر ایک دوسرے سے نکلی چلی آتی ہیں جیسے عمدہ بیج بونے اور مناسب پانی دینے سے تنا، شاخ اور پھول، پتے پھل خود بخود ہی یکے بعد دیگرے نکلتے آتے ہیں۔ دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہو گی تو زبان پر بھی ضرور آئے گی۔ اور جب دل اور زبان دونوں اُس میں مصروف ہوں گے تو عمل خود بخود ہی متاثر ہوتا چلا جائے گا۔ جس ہستی سے واقعی محبت ہو اور اس کی یاد صحیح معنوں میں دل میں موجود رہے، اس کی عملی نافرمانی کرنا قابل فہم نہیں۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا نے کچھ اشعار کہے ہیں جن کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

"تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور ساتھ ہی اس سے محبت ہونے کا اظہار بھی کرتا ہے؟ خدا کی قسم! یہ بات قیاس میں بڑی عجیب و غریب ہے۔ اگر تو اس سے محبت کرتا ہوتا تو تُو اس کا مطیع ہوتا کیوں کہ چاہنے والا اس ہستی کا جسے وہ چاہے، ہمیشہ مطیع ہوتا ہے!"

مفتی محمد حسن فرماتے ہیں کہ حصن حصین میں ہے کُلُّ مُطِیْعٍ ذَاکِرٌ یعنی ہر اطاعت کرنے والا گویا ذکر کرنے والا ہے۔ ذکر کی دو قسمیں ہیں: ایک اللہ اللہ کرنا، دوسرے شریعت کی پابندی کرنا۔

مفتی محمد حسن نے فرمایا کہ ہر معاملے کو شریعت کے مطابق کرنا یہ ذکر حقیقی ہے۔ باقی یہ مروّجہ ذکر جو ہے، یہ ذکر صُوَرِیْ ہے۔

ذکرِ الٰہی کی برکات

انسان رُوح اور مادّے کا مرکب ہے اور ایک صحیح مسلم کی زندگی گزارنے کے لیے اسے دونوں چیزوں کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ورنہ اس کی زندگی میں توازن قائم نہیں رہ سکتا

جو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کو محبوب ہے۔ جو شخص صرف اپنے مادّی جسم کے تقاضے پورے کرتا ہے اور رُوح کی پاکی کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ جلد حیوانوں کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی نشو و نما ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے جسم کے اندر بسنے والی رُوح کی نشو و نما بھی ضروری ہے۔ جسم کی نشو و نما کے لیے جو اہمیت غذا کو حاصل ہے۔ رُوح کی نشو و نما کے لیے وہی حیثیت ذکرِ الٰہی کو حاصل ہے۔ جسم تو اگر کمزور ہو جائے گا تو آنکھوں سے نظر ہی آ جائے گا اور انسان اس کی درستگی کی فکر کرلے گا۔ مگر اندر بسنے والی رُوح آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ اس کی کمزوری اور طاقت کا حال علامت ہی سے معلوم ہوتا ہے، آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا اور وہ علامت اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ اگر یہ یاد دل میں موجود ہے اور اکثر موجود رہتی ہے تو سمجھ جایئے کہ اندر والی رُوح صحیح سلامت تندرست ہے اور اگر یہ یاد کمزور پڑ گئی ہے تو یقین مانیے کہ آپ کی رُوح نحیف و نزار اور بیمار ہے اور اگر یہ یاد خدانخواستہ بالکل ختم ہو گئی ہے تو ماتم کیجیے کہ آپ کی رُوح جاں بلب ہے یا بالکل مر چکی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رُوح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لیے یادِ الٰہی ایک لازمی شے ہے اور رُوح پر اس کا یہ اثر لازماً پڑتا ہے کہ وہ مضبوط، پاکیزہ، پاک صاف اور تندرست و توانا ہوتی ہے۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر چیز کے لیے کوئی صاف کرنے والی اور میل کچیل دُور کرنے والی چیز ہوتی ہے (اور) دلوں کی صفائی کرنے والی چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دلوں کی شفا ہے۔

انسانی زندگی مختلف اقسام کی ذمہ داریوں کے بار سے لدی ہوئی ہے۔ ذمہ داریوں کے علاوہ اور ہزار ہا اقسام کے تفکرات، اُلجھنیں اور پریشانیاں اسے چاروں اطراف سے گھیرے رہتی ہیں۔ یہ سب چیزیں مل کر جسم کے اعصاب میں ایسا کھنچاؤ پیدا کر دیتی ہیں کہ بعض لوگ تو طرح طرح کے اعصابی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تو خصوصی طور پر زندگی کی پریشانیاں، پیچیدگیاں، اُلجھنیں اور غیر محفوظ ہونے کا احساس اتنا بڑھ گیا ہے کہ اعصاب بری طرح متاثر ہوتے ہیں اور اعصابی بیماریوں کی تعداد بہت بڑھتی جارہی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اعصاب کو قوّت عطا کرتا ہے اور انھیں اس قابل بناتا ہے کہ زندگی کی گوناگوں پریشانیوں کا کامیاب مقابلہ کرسکیں۔ جس معاشرے میں اللہ تعالیٰ کی یاد بہت زیادہ ہوگی اس میں

پاگلوں اور اعصابی مریضوں کی تعداد بہت کم ہو گی۔ جس تناسب سے انسان خدا کی یاد سے دُور ہو جاتے ہیں، اسی تناسب سے ان میں اعصابی امراض اور پاگل پن کی تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وجہ سیدھی سی اور بالکل ظاہر ہے کہ جن کے سینے اللہ تعالیٰ کی یاد سے آباد ہوں، ان کے پاس ایک بڑا مضبوط سہارا ہوتا ہے جو انھیں دُکھ اور تکلیف میں سنبھالے رہتا ہے اور جہاں یہ سہارا موجود نہیں ہوتا، وہاں غم کی شدّت کو کم کرنے والی کوئی شے نہیں ہوتی۔ لہٰذا غم، اعصاب اور حواس پر غلبہ پالیتا ہے۔

ذکرِ الٰہی کی سب سے بڑی برکت دل کا سکون ہے جو زندگی کی ایک عظیم نعمت ہے، کلامِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

... اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد: ۲۸)

(خبر دار رہو، اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔)

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جب کوئی گروہ اللہ کا ذکر کرنے کے لیے باہم مل بیٹھتا ہے تو ملائکہ انھیں ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے، ان پر تسکین نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بزم میں یاد کرتا ہے!" (ریاض الصالحین)

ایک دن امیر معاویہؓ مسجد میں آئے تو دیکھا کہ لوگوں کا حلقہ ذکر قائم ہے۔ پوچھا کہ کیوں بیٹھے ہو؟ لوگوں نے بتادیا کہ ذکر الٰہی کرنے کے لیے۔ فرمایا کہ صرف اسی لیے بیٹھے ہو؟ جواب ملا کہ ہاں، صرف اسی لیے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کا حلقۂ ذکر دیکھا تو اسی طرح سوال کیا اور جواب ملنے پر فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے اور خبر دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے سے فرشتوں پر فخر کرتا ہے! (ترمذی)

مولانا رُوم رحمۃ اللہ علیہ ایک حکایت بیان فرماتے ہیں جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"ایک شخص رات کے وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول تھا اور اس کی زبان پر اللہ اللہ کا ورد جاری تھا۔ شیطان نے اسے جھڑک کر کہا: "اے کم بخت! کب تک اللہ اللہ کی رٹ لگائے گا۔ اس طرف سے کوئی جواب ملتا نہیں اور تو ہے کہ مسلسل اس کو پکارے جارہا ہے!" شیطان کی بات سن کر وہ شخص بہت دل شکستہ ہوا۔ سر جھکایا تو نیند آگئی،

خواب میں خضر علیہ السلام کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں: "اے نیک بخت! تو نے ذکرِ الٰہی کیوں چھوڑ دیا۔ آخر تو اس ذکر سے پشیمان کیوں ہو گیا؟"

اس شخص نے کہا کہ "بارگاہِ الٰہی سے مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس لیے فکر مند ہوں کہ کہیں میرے ذکرِ حق کو ردّ نہ کر دیا گیا ہو!"

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ "بارگاہِ الٰہی سے مجھے حکم ہوا ہے کہ تیرے پاس جاؤں اور تجھے بتاؤں کہ تو جو ہمارا ذکر کرتا ہے، وہی ہمارا جواب ہے۔ تیرے دل میں جو سوز و نیاز پیدا ہوتا ہے وہ ہمارا ہی تو پیدا کیا ہوا ہے اور یہ ہمارا ہی کام ہے کہ تجھے ذکرِ الٰہی میں مشغول کر دیا ہے۔ تیرے ہر "یااللہ" کہنے میں سو لبیک پوشیدہ ہیں!"

شکر

بارش ابھی ابھی برس کر تھمی تھی۔ سڑک کے کناروں پر کیچڑ تھا۔ ایک غریب سی عورت میلے کچیلے کپڑے پہنے، موٹی سی پھٹی ہوئی چادر کی بکل مارے گزر رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی تھی اور اُجڑے اُجڑے بال پھٹی ہوئی چادر میں سے باہر جھانک رہے تھے، ماتھے پر پریشانیوں کی لکیریں اور چہرے پر فلاکت! معاً اس کا پاؤں رپٹا اور وہ دھڑام سے کیچڑ میں گری۔ اس کی ہیئت کزائی ایسی تھی کہ ضبط کے باوجود ہنسی نکل گئی۔

جس کھڑکی میں ہم کھڑے تھے وہ دوسری منزل پر واقع تھی اور جس گھر کی یہ کھڑکی تھی وہ سڑک کے اوپر واقع تھا۔ غریب عورت کے چاروں شانے چت گرنے پر میری سہیلی کے چہرے پر ایسی ندامت اور شرمندگی کے آثار پیدا ہوئے گویا وہ عورت نہیں بلکہ وہ خود بھرے بازار میں گر گئی ہو۔ میرے ہنسنے پر اس نے ملامت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بگڑ کر بولی:

"یہ خوب رہی۔ میں اس طرح گر گئی ہوں اور تم کھڑی ہنس رہی ہو!"

یہ بات اس نے کچھ اس انداز سے کہی کہ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں وہم سا گزرا کہ کہیں اس کے حواس پر تو کوئی اثر نہیں ہو چکا۔

"ہوش کی دُعا کرو۔" میں نے کہا: "تم کب گری ہو۔ وہ تو کوئی راستہ چلنے والی عورت گری ہے، تم تو یہاں آرام سے کھڑی ہو!"

اتنی دیر میں وہ سنبھل چکی تھی۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی: "واقعی دیکھو نا میری عقل۔ گری تو وہ عورت ہے اور میں کہہ رہی ہوں کہ میں گری ہوں!" اور پھر اس نے جلدی سے بات کا رُخ بدل دیا۔

چند دن اور گزر گئے۔ ایک دن پھر میں اس سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ پھر ہم اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک فلاکت زدہ عورت سڑک پر سے

گزری۔ کوئی ۵۰ کے قریب سن۔ چہرہ جھرّیوں سے بھرا ہوا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پیوند لگے۔ سر پر بدرنگ پھٹی ہوئی چادر، عصر کا وقت تھا۔ وہ بازار سے کچھ پکانے کی اشیاء لے کر آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں مٹی کی کلیا تھی جس میں تھوڑا سا سرسوں کا تیل تھا اور اس نے سر پر ایک پٹلیا رکھی ہوئی تھی جس میں کوئی سبزی بندھی تھی۔

میری سہیلی عجب بے ساختہ پن سے ہنسنے لگی۔

"اے ذرا مجھے دیکھنا تو" اس نے مجھے ٹھونکا دیتے ہوئے کہا: "دیکھنا تو کہ میں کیسے ہاتھ میں تیل کا کلیا پکڑے اور سر پر سبزی کی پٹلیا رکھے آ رہی ہوں!"

میرے دل پر وہشت طاری ہو گئی، میں نے ہراساں سا ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خدا کے لیے سلیمہ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے حواس تو ٹھیک ہیں نا۔ یہ کیا بات ہے کہ تم ہر میلے کپڑوں والی، اُجڑے بالوں والی، فلاکت زدہ، پریشان حال عورت کے لیے لفظ "میں" استعمال کرنے لگتی ہو۔ یہ ہاتھ میں تیل کی کلیا پکڑ کر اور سر پر سبزی کی پٹلیا رکھ کر جانے والی عورت تم تو نہیں، کوئی اور ہے۔ تم تو یہاں کھڑی ہو!"

اس نے پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اسی طرح کھسیانی ہنسی ہنس کر بات کو ٹالنے لگی۔ مگر اس دفعہ میں نے اسے بات کو ٹالنے نہ دیا اور بری طرح اس کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ مجھے ان بے ربط باتوں کا مطلب بتائے۔ وہ عاجز آ کر کہنے لگی:

"اصل میں بات یہ ہے کہ جب میں راستے میں کسی ایسی عورت کو چلتے دیکھتی ہوں جس کے جسم پر پورے کپڑے اور پاؤں میں پوری جوتی نہیں ہوتی، چہرے پر فلاکت اور بدقسمتی کے آثار ہوتے ہیں، طرزِ عمل اور حالت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم اور آسائش سے کوسوں دُور ہے، تو میرے دل میں بے اختیار یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اصل میں یہ تھی۔ میرے پاس کپڑے بھی نہیں تھے، میں انتہائی غریب تھی۔ میں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا ہوا تھا، میں جاہلِ مطلق اور شائستگی سے کوسوں دُور تھی۔ میں یہ سب کچھ تھی تو پھر دیکھو کہ میرے مالک نے مجھ پر کتنا کرم کیا کہ مجھے اچھا لباس بھی دیا اور مجھے علم کی دولت بھی۔ مجھے گھر بھی اچھا رہنے کے لیے دیا

اور مجھے ہر طرح کا آرام و آسائش بھی دیا۔ یہ سب کچھ اس نے اپنی مہربانی سے مجھے عنایت کر دیا۔ حالاں کہ در حقیقت میں تو وہ غریب عورت تھی جو اپنے اُجڑے بالوں کو میلی چادر میں چھپائے، اپنی ٹوٹی ہوئی جوتیوں کو گھسیٹتے کھڑ کھڑ کرتی سڑک پر چلی جارہی ہے!"

اس کی بات سن کر میرے دل پر رُعب ساطاری ہو گیا۔ اس ناتجربہ کار لڑکی کو کیسے پتے کی بات معلوم ہو گئی جو بڑے بڑے تجربہ کاروں کو بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے یہ کہنے سے کہ "در حقیقت میں وہ لڑکی تھی جو کھڑ کھڑ سڑک پر چلی جارہی ہے۔" اس کی مراد یہ تھی کہ خدا مجھے یہ بھی بناسکتا تھا مگر اس نے مجھے ویسا نہیں بنایا ہے بلکہ ایسا بنایا ہے جیسی کہ میں نظر آرہی ہوں۔

اس نے اپنے طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہر اَن پڑھ، فلاکت زدہ اور محرومیوں میں گھری ہوئی عورت کے بارے میں بار بار یہ سوچنے کے باعث کہ میں یہ بھی ہو سکتی تھی، اب مجھ پر کچھ ایسا اثر ہو گیا ہے کہ بعض اوقات کسی ایسی عورت کو دیکھ کر مجھے غیر ارادی طور پر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ میں ہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ چند بار میں تمہارے سامنے ایسی بات کر گئی ہوں جس سے تم نے یہ سمجھا کہ شاید میں حواس کھو بیٹھی ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اتنی نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں کہ اگر ہم میں ان کا صحیح احساس پیدا ہو جائے تو ہمارا ہر بُنِ مو شکر ادا کرتا رہے۔ مگر چوں کہ یہ نعمتیں ہمیں بکثرت ملی ہوئی ہیں، اس لیے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہمیں منعمِ حقیقی نے اتنے انعامات سے نوازا ہے۔

انسان سے تعلق رکھنے والی جن صفات کو اللہ تعالیٰ نے بہت ہی زیادہ پسند فرمایا ہے ان میں ایک شکر بھی ہے۔ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۴۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِراً عَلِيْماً ۝ (النساء : ۱۴۷)

(آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو، اللہ بڑا قدر داں اور سب کے حال سے واقف ہے۔)

شکر کے اصل معنی اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے

احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔

سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے:

وَ إِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ (ابراهیم :۷)

(اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔)

اس آیت میں بھی شکر کرنے کی فضیلت اور ناشکری کا نقصان واضح کیا گیا ہے۔

سورۂ نحل آیت نمبر ۱۴ میں ارشاد ہوا ہے:

وَهُوَ الَّذِى سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوْا مِنْهُ لَحْماً طَرِيًّا وَ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ج وَ تَرى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهِ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (النحل :۱۴)

(وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے ترو تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو!)

حضور رسولِ مقبول ﷺ خود اللہ تعالیٰ کے انتہائی شکر گزار بندے تھے اور آپ ﷺ نے اپنی اُمت کے لیے بھی اسی شے کو پسند کیا کہ وہ شکر گزار بنے رہیں۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

"بندۂ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کے ہر معاملے اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ اگر اسے خوشی و راحت و آرام پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دُکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے سراپا خیر اور موجب برکت ہوتا ہے!" (مسلم)

ایسے ہی حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہو جاتا ہے جو کھانا کھاتا ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے!" (مسلم)

اقسامِ شکر

واضح رہے کہ شکر کی تین اقسام ہیں: ایک قلبی شکر، دوسرا قولی شکر اور تیسرا عملی شکر۔

قلبی شکر یہ ہے کہ دل میں اس منعم حقیقی کے بے پایاں انعامات کا احساس گہرا رہے، یہ زندگی اور زندگی کے سارے لوازمات جو اس نے محض اپنی رحمت و رأفت کے باعث ہمیں عطا فرمائے اور وہ بے شمار مہلکات جن سے وہ ہمیں بچائے رکھتا ہے اور انہیں معاف بھی فرماتا ہے، اس کی ان سب عنایات کا دل میں گہرا احساس ہونا قلبی شکر ہے۔

اس قلبی شکر کے ساتھ زبان سے شکر کے کلمات ادا کرنے بھی ضروری ہیں۔ دل کے جن جذبات کو ہم زبان سے بھی ادا کرتے رہیں، وہ دل میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں!

عملی شکر میں پہلی بات یہ آتی ہے کہ جو نعمتیں اس منعم حقیقی نے عطا کی ہیں، وہ ٹھیک انھیں راہوں پر صَرف ہوں جنھیں وہ پسند فرماتا ہے۔ مثلاً خدا نے اگر دولت دی ہے اور وہ جائز اور خدا کی رضا حاصل کرنے والے کاموں پر صرف ہو رہی ہے تو یہ اس نعمت کا عملی شکر ہے۔ اسی طرح دل، دماغ، آنکھیں اور دوسری قوّتیں اور صلاحیتیں جو اس نے عطا کی ہیں، اگر اس کی اطاعت اور تابعداری کی راہوں پر صَرف ہو رہی ہیں تو یہ ان صلاحیتوں اور قوتوں کی عملی شکر گزاری ہے۔

عملی شکر گزاری کی دوسری شکل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا کی ہیں، ان میں ان محتاج اور مستحق انسانوں کو شامل کیا جائے جنھیں کسی وجہ سے اس نے وہ نعمتیں عطا نہیں کیں۔ مثلاً خدا نے دولت کی نعمت دی تو غریبوں کی امداد کی جائے۔ صحت کی نعمت دی تو بیماروں کی تیمار داری کی جائے۔ علم کی نعمت دی تو بے علموں کی راہنمائی کی جائے۔ وغیرہ۔

ایک شکر گزار انسان کے لیے شکر کی ان تینوں قسموں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یعنی دل بھی شکر سے معمور رہے اور زبان بھی شکر سے تر رہے اور عمل پر بھی شکر گہرے طور پر اثر انداز رہے۔

جذبۂ شکر پیدا کرنے کے ذرائع

رسولِ مقبول ﷺ نے مسلمانوں کے لیے شاکر بننا جس قدر ضروری سمجھا وہ آپؐ کے

پاک اُسوہ اور آپؐ کے ارشادات سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے جذبۂ شکر پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بتادیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے سے اوپر والے کو دیکھنے کے بجائے اپنے سے نیچے والے کو دیکھے تو اس کے دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہو گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ میرے پاس جوتا نہ تھا اور نہ جوتا خریدنے کے لیے پیسے تھے۔ میں سخت دل تنگ ہو کر مسجد میں جا بیٹھا تو وہاں ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے سرے سے پاؤں ہی نہ تھے۔ اس سے میرے دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہوا کہ چلو، اگر جوتا نہیں تو نہ سہی، میرے پاؤں تو سلامت ہیں۔

جذبۂ شکر پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ یہ ہے کہ جو نعمتیں حاصل ہوں، دل میں ان کا گہرا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ کوئی غریب آدمی کسی شخص کے پاس گیا اور اپنے افلاس کا بہت زیادہ رونا رویا کہ بالکل ہی تہی دست ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ میں تمہیں ایک لاکھ روپیہ دوں گا بشرطیکہ تم اپنا ایک پاؤں کاٹ کر مجھے دے دو۔ سوالی یہ سن کر سخت ناراض ہوا اور صاف جواب دے دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس شخص نے کہا، چلو دوست پاؤں نہ سہی، ایک ہاتھ ہی کاٹ دو۔ تم دوسرے ہاتھ سے بہت کام کر سکتے ہو۔ مانگنے والے نے یہ بات بھی نہ مانی۔ اس شخص نے کہا، اچھا، ہاتھ نہ سہی ایک آنکھ ہی نکال دو۔ اس سے تو تمہیں کوئی زیادہ نقصان نہیں ہو گا۔ ایک آنکھ سے بھی تم دنیا کے کام کاج کر سکتے ہو، سوالی نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں آنکھ بھی نہیں دے سکتا۔ اس شخص نے کہا، اچھا اب میں تم سے آخری بات کرتا ہوں، اور وہ یہ کہ تم مجھے اپنا کان کاٹ کر دے دو۔ اس سے تو قطعی کوئی حرج واقع نہیں ہو گا۔ اوپر کان کٹ بھی جائیں تو بھی تم سب باتیں برابر سنتے رہو گے۔ سوالی بگڑ کر بولا: ایسے بھی میں نہیں کروں گا!

اس شخص نے کہا: ”میاں! پھر ذرا غور کرو کہ اتنے لاکھوں کا مال تمہارے پاس ہے اس کے باوجود تم روتے ہو کہ میں مفلس ہوں۔ اب تمہارا ہر عضو جو میں نے ایک ایک لاکھ روپے کے عوض مانگا تھا، لاکھ سے زیادہ قیمتی تھا۔ تبھی تو تم نے مجھے دینا منظور نہیں کیا۔ اب بتاؤ تم مفلس ہو یا لکھ پتی!“

پھر اس عقلمند انسان نے اس مفلسی کا رونا رونے والے کو سمجھایا کہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ

نے بنیادی دولتیں عطا کر رکھی ہوں وہ فی الحقیقت دولت مند ہی ہوتا ہے۔ اس کی اس حالت میں، جس میں اس کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل ہو اور اس حالت میں جس میں اس کے پاس روپے کی کمی ہو، بس اتنا ہی فرق ہے کہ ایک انسان کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے اور دوسرے کے پاس ایک لاکھ روپیہ اور ایک آنہ۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جس کے پاس ایک لاکھ روپیہ اور ایک آنہ ہو، وہ ایک لاکھ روپیہ رکھنے والے سے زیادہ امیر ہے؟ بنیادی دولتوں کی موجودگی میں دنیاوی دولتوں کا ہونا در حقیقت ایک آنے ہی کا فرق ڈالتا ہے۔

ایک مقامی اسکول کی بارہ تیرہ سالہ بچی اسکول میں اپنی ہم جولیوں کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ باتوں باتوں میں وہ کہنے لگی کہ میرے دل میں بڑی حسرت ہے کہ میں کبھی اسکول سے گھر دیر کر کے جاؤں تو گھر میں مجھے کوئی ڈانٹے اور مارے اور کہے کہ خالدہ! تم دیر کر کے کیوں آئی ہو۔ میں جلدی گھر چلی جاؤں یا دیر کر کے جاؤں مجھے کوئی نہیں جھڑکتا۔ کاش مجھے کوئی جھڑکنے والا ہوتا۔

بات یہ تھی کہ بچی کی ماں فوت ہو چکی تھی۔ باپ اپنے کام سے دیر سے واپس آتا تھا اس لیے اگر وہ دیر سے بھی گھر جاتی تھی تو گھر میں کوئی تھا ہی نہیں جو اسے ٹوکتا۔ یہ روک ٹوک اس کی ایک حسرت بن کر رہ گئی تھی۔

اب ذرا خیال کریں کہ کتنے بے شمار نوجوان بچے اور بچیاں ہیں جن کے گھروں میں روکنے ٹوکنے والے ماں باپ موجود ہیں، مگر انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ روک ٹوک جو ہم پر کی جاتی ہے، یہ کوئی نعمت ہے اور جنھیں حاصل نہیں ہوتی ان کے لیے یہی شے حسرت بن جاتی ہے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ کے متعلق ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن ایک شخص کے سر میں درد تھا۔ وہ سر کو پٹی باندھ کر ہائے وائے کرتا ان کے پاس پہنچا کہ دعا کیجیے، بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا: "اے شخص! اتنی دیر خدا نے تمہیں صحت دیئے رکھی۔ کبھی شکر کی پٹی باندھی تھی؟ آج ذرا سر کو درد ہوا تو ناشکری کی پٹی باندھ کر آ گئے ہو!"

ایک خاتون کو دانت کے درد کی تکلیف تھی۔ تکلیف کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ لیٹنا ممکن نہ تھا۔ اگر درد تھما ہوتا تو لیٹتے ہی شدید ہو جاتا، پوری پوری رات ان کی بیٹھے گزر جاتی انھوں نے بیان کیا کہ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے شدید طور پر یہ احساس پیدا ہوا کہ یہ جو ہم دن بھر کا کام کر کرا کر رات کو مزے سے بستر پر لیٹ جاتے ہیں، یہ بھی خدا کی نعمت ہے۔ زمانۂ جنگ میں جب ایک ایک رات

کے دوران میں کئی کئی بار خطرے کا سائرن ہوتا ہو اور لوگوں کو بستروں سے اُٹھ اُٹھ کر پناہ گاہوں میں جانا پڑتا ہو، تو خیال کیجیے کہ وہ رات کی نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہے جو آپ پہلے پہر شروع کرتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ انشاءاللہ صبح تک سوتے رہیں گے۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے چاروں طرف اپنے انعامات اس کثرت سے بکھیرے ہوئے ہیں کہ ایک دیکھنے والی آنکھ اور احساس کرنے والا دل کبھی شکر گزاری سے معمور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جذبۂ شکر کے پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ، قناعت ہے۔ قناعت کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ انسان روزی کی فراخی کے لیے کوشش نہ کرے بلکہ قناعت سے یہ مراد ہے کہ ٹھیک ٹھیک حلال ذرائع سے جتنا مل جائے، اس پر خوش و خرّم اور شکر گزار رہا جائے اور حرام ذرائع کا خیال بھی دل میں نہ لایا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص زیادہ کی حرص میں گرفتار نہیں ہوگا، اسے جتنا بھی اللہ تعالیٰ پاک ذرائع سے دے دے گا، اس پر شکر گزار رہنا اس کے لیے زیادہ آسان ہوگا۔

آخر میں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندے کے لیے شکر گزار رہنے کو اتنا پسند فرمایا ہے اور حضور ﷺ نے جو مسلمانوں کو ایک عبد شکور (بہت زیادہ شکر کرنے والا بندہ) بن کر دکھایا اور ان کے لیے بھی شکر گزار بندہ بننے کو پسند فرمایا ہے، تو یہ اس لیے کہ شکر گزار بنے رہنے میں خود انسان ہی کا فائدہ ہے، جس انسان کو اپنے مولا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا احساس رہے، اس کے دل میں امن، سکون اور خوشی، اس شخص کے دل کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوگی جسے ان نعمتوں کا احساس نہ ہوگا۔ حالاں کہ ہو سکتا ہے کہ درحقیقت یہ نعمتیں اس ناشکرے کے پاس شکر گزار بندے کی بہ نسبت زیادہ ہوں۔ دل کی یہ خوشی اور سکون بہت بڑی دولت ہے اور دُنیاوی دولتیں سمیٹنے سے بھی لوگوں کا اصل مقصود یہ دل کی خوشی حاصل کرنا ہی ہوتا ہے؛ اگرچہ وہ یہ نکتہ نہیں سمجھتے ہیں کہ دنیا کے ساز و سامان کی حرص درحقیقت دل کو خوشی سے محروم کیے رہتی اور ایک مستقل بے چینی میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔

پھر اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے نعمتوں میں زیادتی ہوتی ہے جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی مندرجہ بالا آیت میں بیان ہو چکا ہے۔

اللہ ربّ العالمین کو نہ تو ہمارے شکر کی حاجت ہے اور نہ ہمارے کفرانِ نعمت سے اسے نعوذ باللہ کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو ہمارا اپنا ہی فائدہ ہے جس کے باعث شکر گزار رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

سورۂ النمل آیت نمبر ۴۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"... فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ، لِیَبْلُوَنِیْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ۝ (النمل : ۴۰)

جوں ہی کہ سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اٹھا: یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے۔ ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو مومن شکر گزار ہوتا ہے وہ عافیت سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔

حبّ الٰہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ محبوب کی طرف سے جو انعام و اکرام عطا ہو دل ان کے احساس سے معمور اور زبان ان کے اظہار میں مصروف رہے!

توکل

بعض الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم معین کرنے میں انسانوں نے طرح طرح کی غلطیاں کی ہیں۔ انھیں الفاظ میں ایک لفظ "توکل" بھی ہے۔ توکل کا عام سادہ مفہوم تو یہی ہے کہ خدا پر بھروسہ کیا جائے؛ مگر بھروسہ رکھنے کی صورت کیا ہو؟ یہاں آکر رائیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ ایک گروہ نے غلط طور پر توکل کا مطلب یہ سمجھا کہ عمل اور کوشش کو چھوڑ دینا اور خدا کے بھروسے پر بیٹھے رہنا توکل ہے۔ حالاں کہ یہ توکل نہ خدا نے بتایا ہے نہ خدا کے رسولِ مقبول ﷺ نے۔ یہ توکل نہیں بلکہ بے عملی ہے اور بے عملی کو اسلام میں ناپسند کیا گیا ہے۔

حضور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں توکل کا جو مفہوم متعین ہوتا ہے، وہ تو یہ ہے کہ انسان کوشش تو پوری کرے مگر کوششوں کے نتائج کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اور بھلائی کی اُمید رکھے، اس کے ساتھ اسے یہ بھی یقین ہو کہ کامیابی اس کی اپنی کوششوں کی بنا پر نہیں، بلکہ خدا کی مہربانی سے ہوتی ہے اور کوشش جو وہ کر رہا ہے، تو اس لیے کر رہا ہے کہ خدا نے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔

اس توکل کے دل میں پیدا ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں، انسان یاس و نااُمیدی کا شکار نہیں ہوتا۔ جب اسے پورا یقین ہو کہ قدرت ساری کی ساری خدا کے ہاتھ میں ہے، تو پھر اسے اس بات کا یقین بھی ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے حالات بدل بھی سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ دُنیا عالم اسباب ہے یہاں کے ہر واقعہ کے پیچھے عموماً کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ مگر ایک اور حقیقت اس سے بھی بڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا مسبّبُ الاسباب ہے۔ جب اسے کسی فرد یا قوم کو کوئی کامیابی عطا کرنی ہوتی ہے، وہ اسباب ہی ایسے پیدا کر دیتا ہے کہ جن کے نتائج کے طور پر وہ کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔

یہی وہ توکل ہے جس کا خدا نے حکم دیا اور رسولِ مقبول ﷺ نے ساری عمر اس پر عمل کیا

اور مسلمانوں کو اپنے اندر اسے پیدا کرنے کی تلقین فرمائی۔

اسی توکل کی بنا پر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں بے پناہ استقلال، عزم، جرأت اور بے باکی پیدا ہو چکی تھی۔ متوکل جو صحیح معنوں میں متوکل ہو، شدید سے شدید حالات میں بھی یاس کا شکار نہیں ہو گا۔ مشکل سے مشکل اوقات میں بھی بے صبری کا اظہار نہیں کرے گا اور پر خطر سے پر خطر راہوں میں بھی کم ہمتی اور بزدلی نہیں دکھائے گا۔ جب کامیابی اس ضعیف البنیان کی کوششوں کی بنا پر نہیں بلکہ اس قادرِ مطلق کے حکم کی بنا پر آتی ہے جو سب کچھ کر سکتا ہے تو پھر مایوسی کیوں؟ ہاں، انسان کا فرض ہے کہ انتہائی کوشش کرے کیوں کہ خدا نے اسے انتہائی کوشش کرنے کا حکم دیا ہے اور خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے اسے خدا کی رحمت اور امداد کی توقع رکھنے کا حق نہیں۔

اس بات کو ایک آسان مثال کے ذریعہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ کسی علاقے کا واٹر ورکس اس علاقے کے گھروں میں پانی پہنچاتا ہے۔ یہ پانی جو گھروں کو مل رہا ہے اصل میں واٹر ورکس سے مل رہا ہے۔ مگر پانی کو گھروں تک پہنچانے کے لیے نلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ نل خود گھروں کو پانی نہیں دیتے بلکہ واٹر ورکس کے دیئے ہوئے پانی کو گھروں تک پہنچانے کے ذریعے ہیں۔ یہی حال اس دنیا میں ہماری کوششوں اور اسباب کا ہے۔ وہ خود کامیابی نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ کامیابی کو ہم تک پہنچانے کے ذرائع بنتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ پانی کے نل ہی در حقیقت پانی پیدا کر رہے ہیں تو ہم اس پر ہنسیں گے کہ کیسی نادانی کی بات کر رہا ہے۔ ایسی ہی نادانی ہم کرتے ہیں جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کوششیں ہی در حقیقت کامیابی لا رہی ہیں۔

توکل کرنے والے اور توکل نہ کرنے والے میں یہ بڑا بنیادی فرق ہے کہ توکل کرنے والا اپنی انتہائی کوشش کر کے بھی کامیابی کو خدا کی مہربانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ توکل نہ کرنے والا کامیابی کو اپنی کوششوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ چناں چہ توکل کرنے والے کو اپنی سعی و کوشش کے بعد کامیابی نظر آئے یا نہ آئے، وہ کوشش جاری رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس نے تو پہلے ہی کامیابی کو کوششوں کا نتیجہ نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ کوشش فرماں برداری کے لیے کی تھی اور فرماں برداری تو ساری زندگی ضروری ہے۔ اس کے برعکس جس نے کامیابی کو محض اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دیا تھا، اسے جب کامیابی کے حصول میں دیر لگے گی تو وہ بددل ہو کر کوشش بھی چھوڑ دے گا۔

اس طرح توکل در حقیقت سعی و عمل جاری رکھنے کی طرف اُبھارتا ہے اور عدم توکل

خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ انسان بد دل ہو کر سعی و عمل کو چھوڑ بیٹھے چناں چہ جو لوگ توکل کا یہ مفہوم سمجھتے ہیں کہ بے عمل رہ کر کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھا جائے۔ ذرا خیال کیجیے کہ انھوں نے اس لفظ کا مفہوم کتنا غلط سمجھا ہے۔

جو دل خدا کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں ان میں دوسری اعلیٰ صفات کے علاوہ یہ توکل کی صفت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور یہ توکل انھیں ہمیشہ ثابت قدم، پر اُمید، بہادر، نڈر اور شجاع بنائے رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ الفرقان آیت ۵۸ میں توکل کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهِ ط وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۝ (الفرقان: ۵۸)

(اے نبیؐ، اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اس کا باخبر ہونا کافی ہے۔)

سورۂ الشعراء ۲۱۷ تا ۲۱۹ میں ارشاد ہوا ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ (الشعراء: ۲۱۷-۲۱۹)

(اور اُس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمھیں اُس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اُٹھتے ہو اور سجدہ ریز لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔)

سورۂ النحل آیت ۹۹ تا ۱۰۰ میں فرمایا ہے:

إِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ إِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝

(النحل: ۹۹-۱۰۰)

(اس (شیطان) کو ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں۔)

سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹ تا ۱۶۰ میں بیان ہوا ہے:

... فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ ج وَ إِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَالَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهٖ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

(آل عمران : ۱۵۹-۱۶۰)

(... پھر جب (اے نبی ﷺ) تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کر سکتا ہے۔ پس جو سچے مومن ہیں، انھیں اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"میری اُمت میں ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے اور یہ وہ بندگانِ خدا ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کراتے اور شگونِ بد نہیں لیتے اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں!" (بخاری، مسلم)

اس حدیث میں ستر ہزار سے غالباً مراد کثیر تعداد ہے۔ کیوں کہ عربی زبان اور محاورے میں یہ عدد کثرت اور غیر معمولی بہتات کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے والے دُکھ اور بیماری یا کسی اور تکلیف کے وقت یا کوئی کام کرنے سے پہلے جنتر منتر یا شگون بد لینے جیسے ممنوع افعال کا ارتکاب نہیں کرتے۔ بلکہ کسی تکلیف کے دور ہونے یا کسی عمل کے کامیاب ہونے کے سلسلے میں خدا ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"اگر تم اللہ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمھیں اس طرح روزی دے جس طرح کہ پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح کو بھوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں!" (ترمذی، ابن ماجہ)

اس حدیث کی تشریح میں بتایا جاتا ہے کہ پرندوں کے ساتھ تشبیہ دینے سے حضور نبی کریم ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جس طرح خدا پرندوں کو سہولت سے رزق عطا کرتا ہے، اسی طرح تمھیں

بھی سہولت سے روزی عطا کرے۔ باقی کوئی اگر اس حدیث سے یہ مفہوم نکالنا چاہے کہ توکل کرنے والوں کو خدا بغیر سعی اور کوشش کے رزق عطا کرے گا، تو ایسا کرنا درست نہیں ہو گا۔ کیوں کہ پرندے بھی تو اپنے آشیانے سے نکل کر نقل و حرکت کرتے ہیں تبھی رزق پاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن میں رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ ایک ہی سواری پر بیٹھا ہوا تھا کہ آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اے لڑکے! تو اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ (اور اس سے غافل نہ ہو) اللہ تعالیٰ تیرا خیال فرمائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھ، تو اس کو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کوئی چیز مانگنا چاہے تو بس اللہ ہی سے مانگ؛ اور جب تو کسی مدد کا محتاج ہو تو اللہ ہی سے امداد طلب کر اور (اچھی طرح) جان لے کہ اگر ساری انسانی برادری بھی باہم متفق ہو کر چاہے کہ تجھے کسی شے سے فائدہ پہنچائے تو صرف وہی شے تجھے فائدہ پہنچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدر کر دی ہے اور اسی طرح اگر ساری انسانی برادری جمع ہو کر تجھے کسی چیز سے نقصان پہنچانا چاہے تو صرف وہی چیز نقصان پہنچا سکے گی جس سے نقصان پہنچنا اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدّر کر دیا ہے۔ قلم اُٹھ چکے اور روشنائی خشک ہو گئی۔"

اس حدیث میں کمال وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ ہر طرح کا نفع اور نقصان خدا ہی کی طرف سے آتا ہے اور اسی پر بھروسہ ہونا چاہیے۔

توکل کرنے والوں کو اپنی سعی و جہد کا فوری نتیجہ حاصل ہو یا نہ ہو، وہ خدا کے فیصلہ پر راضی رہتے ہیں اور اس پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنی کوششیں جاری رکھتے اور اس سے خیر اور بھلائی کے طالب رہتے ہیں۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"آدمی کی خوش بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے جو فیصلہ ہو، وہ اس پر راضی رہے اور آدمی کی بد بختی اور بد نصیبی میں سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی کا طالب نہ ہو اور اس کی بد بختی اور بد نصیبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ناخوش ہو!"

(مسند احمد، جامع ترمذی)

خدا پر توکل کرنے والوں کا حوصلہ بھی بلند ہو جاتا ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ کر کے بڑے بڑے کاموں میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اگر وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو وہ اتراتے نہیں اور فخر نہیں کرتے کیوں کہ ان کا ایمان ہوتا ہے کہ کامیابی ہماری کوششوں سے نہیں، خدا کی مہربانی سے آتی ہے؛ اور اگر کسی وجہ سے وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں تو وہ ایسی دل شکستگی کا شکار بھی نہیں ہوتے کہ آس اُمید چھوڑ کر بیٹھ جائیں۔

سورۂ حدید آیات ۲۲ اور ۲۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۝ لِّكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ ۝ (الحدید: ۲۲، ۲۳)

(کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو وجود میں لانے سے پہلے ایک کتاب (نوشتہ تقدیر) میں لکھ نہ دیا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمھیں ہو، اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمھیں عطا فرمائے، اس پر پھول نہ جاؤ!)

ابتدا میں اسلام قبول کرنے والوں نے کفار کے ہاتھوں جو مظالم سہے تھے، آج بھی انھیں پڑھ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ کیا کیا سختیاں تھیں جو ان پر نہ توڑی گئیں اور کیا کیا شدائد تھے جو خود حضور ﷺ کی راہ میں رُکاوٹیں بن کر نہ آئے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہی تھا جس نے حضور ﷺ کو نا اُمید نہ ہونے دیا۔ مکہ مکرمہ میں ایک مایوس، مصیبت زدہ صحابی کو دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا!" (بخاری)

ابن ہشام میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب ایک مرتبہ آپؐ کے عزیز اور ہمدرد چچا ابو طالب نے بھی آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ اپنا تبلیغ اسلام کا کام چھوڑ دیں تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

"عمّ محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجیے۔ حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا۔

عجم و عرب ایک دن اس کے ساتھ ہو گا!"

ایک دن کچھ کفار نے حرم میں بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ جوں ہی حضور ﷺ حرم میں قدم رکھیں (نعوذ باللہ) آپ کی بوٹی بوٹی اُڑا دی جائے۔ حضرت فاطمہؓ نے یہ بات سن لی وہ روتی ہوئی آئیں اور آپؐ کو یہ بات بتائی۔ آپؐ نے ان کو تسلی دی اور وضو کے لیے پانی مانگا۔ وضو کر کے آپؐ بے خطر حرم کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب آپ خاص صحن حرم میں پہنچے اور کفار کی نظر آپ پر پڑی تو خود بخود ان کی نگاہیں جھک گئیں۔ (مسند احمد)

جب حضور ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ غارِ حرا میں پناہ گزین تھے تو تعاقب کرنے والوں میں سے کچھ لوگ غار کے قریب آپہنچے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی! حضور ﷺ نے پرسکون الفاظ میں فرمایا: "غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے!"

آپؐ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، راستے میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ آپؐ ایک جگہ استراحت فرمانے لگے۔ صحابہ کرام بھی اِدھر اُدھر سو رہے تھے۔ آپؐ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک بدّو آیا اور آپؐ کی تلوار اتار کر بے نیام کر لی۔ آپؐ دفعتہً ہوشیار ہو گئے۔ دیکھا تو ایک بدّو ہاتھ میں تلوار لیے کھڑا تھا۔ بدّو نے کہا:

"اے محمد! (ﷺ) اب تمھیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟" آپؐ نے اطمینان سے فرمایا: "اللہ" (بخاری)

اور بدّو آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

اللہ ربّ العالمین نے ضعیف البنیان انسان کو اپنی زبردست ذات پر بھروسہ کرنے کا حکم دے کر دراصل اسے طاقت کا خزانہ عطا فرما دیا ہے۔ انسان پر حیف ہے کہ اگر وہ اس بے پناہ طاقت سے فائدہ اُٹھانے میں سستی برتے!

اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے محبت کرنا

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہو کر آئی۔ اس کا بچہ گم ہو گیا تھا۔ مامتا کی محبت کا یہ جوش تھا کہ جو کوئی بچہ اسے مل جاتا، اس کو سینے سے لگا لیتی۔ حضور رسول مقبول ﷺ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے!"

لوگوں نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

"تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس عورت کو اپنے بچے سے ہے!" (بخاری)

ایسے ہی حضور ﷺ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے۔ ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:

"یارسول اللہ! (ﷺ) ایک ماں کو اپنے بچے سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں؟"

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ہاں، بے شک ہے!"

یہ سن کر عورت نے کہا:

"کوئی ماں تو اپنے بچے کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی۔"

یہ سن کر شدّتِ تاثر سے آپؐ رو پڑے۔ پھر سر اُٹھا کر فرمایا:

"خدا صرف اس بندے کو عذاب دے گا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے!"

(ابن ماجہ)

ایک بار نبی ﷺ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند

اور اس کے بچوں کو لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کیا: "یارسول اللہؐ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اُٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا۔ ان کی ماں میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے ذرا سا کپڑا کھولا تو وہ بچوں پر گر پڑی!" یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تمھیں تعجب ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ محبت ہے!" (مشکوٰۃ بحوالہ ابی داوٗد)

یہ واقعات اس حقیقت کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ اگر انسان اپنے خالق و مالک سے محبت رکھے تو وہ خود مہربان و رحیم خالق بھی انسان سے اسی درجہ محبت رکھتا ہے کہ انسانی رشتہ و پیوند میں کوئی انتہائی محبت رکھنے والا رشتہ بھی محبت کے اس مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ ویسے تو اللہ ربّ العالمین اپنے بندوں پر بہ حیثیتِ مجموعی ہی شفقت فرمانے والا ہے۔ تاہم ان مخصوص اوصاف سے واقفیت ضروری ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا مستحق بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے؟

کلام پاک میں جا بجا ان اوصاف کا ذکر آیا ہے جن کو اپنا کر انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات انھیں خوش بخت انسانوں کا ذکر کر رہی ہیں جو اپنے اخلاقِ عالیہ کے باعث اس اعزاز کے مستحق ہوئے:

قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ج وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۞ (آل عمران : ۷۵،۷۶)

(... وہ کہتے ہیں کہ امیوں (یعنی غیر یہودیوں) کے مقابلے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالاں کہ انھیں معلوم ہے (کہ اللہ نے ایسی بات نہیں فرمائی ہے) آخر کیوں ان سے باز پُرس نہ ہو گی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا، تو بیشک اللہ برائی سے بچ کر رہنے والوں سے محبت کرتا ہے!)

وَسَارِعُوْٓا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ لا أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۳۳،۱۳۴)

(دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمان جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ خوش حال ہوں یا بد حال اور جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں اور خدا ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے!)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ج فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۴۶)

(اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں، ان سے وہ دل شکستہ نہ ہوئے، نہ انھوں نے کمزوری دکھائی اور نہ وہ (باطل کے آگے) سرنگوں ہوئے اور خدا ایسے صابروں سے محبت رکھتا ہے!)

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۴۸)

(آخر کار اللہ نے انھیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت میں بھی عطا کیا۔ اللہ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے!)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۵۹)

(اے پیغمبر! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے لہٰذا ان کے قصور معاف کردو اور ان کے حق میں دُعائے مغفرت کرو۔ اور (دین کے کام میں) انھیں شریکِ مشورہ رکھو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر پکا ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔)

... وَ إِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (المائدہ : ۴۲)

(... اور (اے نبی ﷺ) اگر تم (ان یہودیوں کے مقدمات کا) فیصلہ کرو تو پھر ان کے درمیان ٹھیک انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔)

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَ أَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (المائدہ : ۹۳)

(جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آیندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں۔ پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رُکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو، اسے مانیں۔ خداترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ خدا نیک رویہ رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

... وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

(التوبۃ : ۳،۴)

(... اور (اے نبی ﷺ) انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

بجز اُن مشرکین کے، جن سے تم نے معاہدے کیے، پھر انھوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی۔ تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی معاہدے کی مدّت تک وفا کرو، کہ اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔)

... فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ (التوبة : ۷)

(... جب تک وہ (مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا) تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

"... لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝

(التوبة :۱۰۸)

(... اے نبی ﷺ! جو مسجد روزِ اوّل سے تقویٰ پر قائم کی گئی، وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ج فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰىٓ أَمْرِ اللّٰهِ ج فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ أَقْسِطُوْا ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الحجرات : ۹)

(اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔)

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝ (الصف : ۴)

(بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔)

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (آل عمران : ۳۱)

(اے نبی! (ﷺ) (لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔)

کلامِ پاک کی ان آیات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے والے خوش بخت انسانوں میں حسبِ ذیل صفات پائی جاتی ہیں:

تقویٰ

عفو

جہاد فی سبیل اللہ

صبر

خیرات کرنا

نیکو کاری

عدل و انصاف

توکل

پاکیزگی

معاہدات کو پورا کرنا، اور

اطاعتِ رسول ﷺ وغیرہ۔

تقویٰ

اللہ تعالیٰ کے خوف کے باعث گناہوں سے پرہیز کرنے کو تقویٰ کہا جاتا ہے، جس انسان

کے دل میں یہ خواہش اچھی طرح جڑ پکڑ چکی ہو کہ میں گناہوں سے بچار ہوں اور وہ اس خواہش کے مطابق گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش بھی کرتا رہے تو اسے "متقی" کہا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب نے ایک دفعہ حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تقویٰ کا مطلب دریافت کیا تھا۔ حضرت کعبؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کبھی ایسے راستے سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف کانٹوں والی جھاڑیاں ہوں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کئی دفعہ گزرا ہوں۔ حضرت کعبؓ نے پوچھا: "پھر آپ کیا کرتے ہیں؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کپڑے سمیٹ لیتا ہوں تاکہ کانٹوں میں نہ الجھیں۔ حضرت کعبؓ نے کہا کہ یہی تقویٰ ہے۔

حضرت کعبؓ بڑے دانا اور عقلمند انسان تھے۔ انھوں نے انتہائی خوبصورت طریقے سے تقویٰ کی تعریف فرمادی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں، ایک ایسی راہ ہے جس کے دونوں طرف گناہوں کے کانٹے لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف آزمائشیں بکھری پڑی ہیں اور ہم کسی وقت کسی آزمائش کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جو انسان زندگی گزارتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھے کہ کہیں میں کسی غلط راہ پر نہ چل پڑوں، وہ متقی ہے۔

عفو

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک عفوّ بھی ہے۔ یعنی معاف کرنے والا۔ وہ خود بھی اپنے گنہگار بندوں کو کثرت سے معاف کرتا ہے اور انسانوں کے بارے میں بھی یہی پسند فرماتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خطاؤں اور زیادتیوں کو معاف کردیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دُنیا میں عفو نہ رہے اور ہر انسان دوسرے سے پورا پورا بدلہ لینے پر تل جائے تو زندگی کی بہت سی خوبصورتی ختم ہو جائے اور یہ آباد دُنیا تھوڑے ہی عرصے میں برباد ہو کر رہ جائے۔

غم و غصے کے اظہار کا اصل موقع وہ ہوتا ہے جب انسانوں کی عزّت اور آبرو پر حملہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک رشتہ دار تھے جن کا نام مسطح تھا۔ حضرت ابو بکرؓ ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت مسطحؓ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بعض ناپسندیدہ باتیں پھیلانے میں حصہ لیا۔ اس سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو قدرتی طور پر رنج ہوا اور انھوں نے

حضرت مسطحؓ کی مالی امداد بند کر دی۔ اس پر سورۂ نور آیت ۲۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلاَ يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُّؤْتُوآ أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهَاجِرِيْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَ لْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْاط أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور: ۲۲)

(تم میں جو لوگ صاحبِ فضیلت اور کشائش والے ہیں، وہ قرابت داروں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، بلکہ چاہیے کہ (ان کے قصور) بخش دیں اور در گزر کریں، (مسلمانو) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے۔)

جوں ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو وہ پکار اُٹھے کہ: "خدا کی قسم! میں تو چاہتا ہوں کہ خدا میرے قصور معاف کر دے!" اور پھر آپ نے حضرت مسطحؓ کا وظیفہ دوبارہ جاری کر دیا۔

حضرت ابو مسعودؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی: "جان لو۔ جان لو......" میں نے مڑ کر دیکھا تو حضور ﷺ فرما رہے تھے:

"ابو مسعودؓ! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ قابو خدا کو تم پر ہے۔"

حضرت ابو مسعود کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے فرمانے کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ پھر میں نے کبھی کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک دفعہ ایک شخص نے رسولِ اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ: "یا رسول اللہ! میں اپنے غلام کا قصور کتنا معاف کیا کروں؟" آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس شخص نے پھر یہی سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا: "ہر روز ستر دفعہ۔" (ترمذی)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بار بار معاف کر دینے سے ہمارے رُعب داب اور وقار میں کمی آجائے گی۔ حالاں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص عفو و درگزر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عزّت ہی بڑھاتا ہے!" (ترمذی)

جہاد فی سبیل اللہ

اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ سورۂ آل عمران آیات

۱۶۹ تا ۱۷۰ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ۞ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ...“

(آل عمران: ۱۶۹،۱۷۰)

(جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ سمجھو، حقیقت میں وہ زندہ ہیں؛ اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔ خدا نے انھیں اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔...)

جو عمل انسان کے لیے اس درجہ اعزاز کا ذریعہ بننے والا ہو کہ اسے مرنے کے بعد بھی مردہ سمجھنے کی اجازت نہ ہو، اس کی فضیلت میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انسان میں سب سے بڑی بد اخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔

حضرت عبداللہ بن اوفیٰ نے ایک خط لکھ کر بھیجا جس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ: ”رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو!“ اسی خط میں حضور ﷺ کا وہ مشہور فقرہ بھی ہے کہ:

”جان لو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے!“ (بخاری)

خود حضور ﷺ کی شجاعت کا یہ حال تھا کہ غزوۂ حنین کا ذکر کرتے ہوئے حضرت براءؓ نے بیان کیا خدا کی قسم! جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپؐ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے۔ ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپؐ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ (مسلم)

صبر

عربی زبان میں صبر ایک پھل کو کہتے ہیں جس کا مزا کڑوا ہوتا ہے، مختلف اقسام کی جسمانی، ذہنی، رُوحانی تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لینے کو صبر کہا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں صبر کی جس خاص شکل کی طرف اشارہ ہے، یہ وہ صبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے خدا کی راہ میں آنے والے مصائب و آلام کے مقابلے میں کیا تھا۔ دورانِ جنگ

میں جو تکالیف مجاہدین کو سہنی پڑتی ہیں، وہ کسی بے صبر انسان کے بس کا روگ نہیں ہوتیں۔ انھیں وہی لوگ برداشت کر سکتے ہیں جنھیں خدا، خدا کے رسولؐ اور خدا کے دین کی سربلندی کے مقابلے میں نہ جان پیاری ہو نہ مال؛ نہ آل اولاد نہ کوئی اور رشتے۔ جن کی غیرت و حمیتِ اسلامی کا یہ عالم ہو کہ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جانا منظور ہو مگر دشمن کے آگے کمزوری دکھانا اور باطل کے آگے سر جھکانا کسی صورت منظور نہ ہو۔ انھیں صابروں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ان سے محبت رکھتا ہے۔

خیرات

سورۂ بقر آیت ۲۶۱ میں اللہ تعالیٰ نے راہِ خدا میں خرچ کرنے والوں کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ : ۲۶۱)

(جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔)

ایک دفعہ خود حضور ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا:

"ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے۔ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں!" (مسلم)

حضور ﷺ نے فرمایا:

"اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر ہے، اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے برا ہے!"

حضور ﷺ کی تعلیمات کا صحابہ کرام پر یہ اثر ہوتا تھا کہ کوئی دولت مند ہو تا یا غریب، ہر حال میں راہ خدا میں خرچ کرنے کو تیار رہتا تھا۔ ایک بار قبیلہ معز کے بہت سے فاقہ زدہ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان کی حالت دیکھی تو چہرے کا رنگ بدل گیا۔ نماز کے بعد خطبہ دیا اور لوگوں کو ان کی امداد کی ترغیب دلائی۔ اس پر ایک صحابی درہم و دینار کی اتنی وزنی تھیلی لائے جسے وہ بمشکل اُٹھا سکتے تھے اور اسے حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ دوسری طرف ایک دفعہ ایک غریب صحابی نے ڈول کھینچنے کی اجرت میں ایک صاع پایا اور اسے خیرات کر دیا۔

عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو حصوں میں برابر اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں بھی ذرا کمی بیشی نہ ہو تو اس کو عربی زبان میں "عدل" کہتے ہیں۔ چناں چہ عدل یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے یا جو کام بھی کیا جائے، اس میں سچائی کی میزان ناحق طور پر کسی طرف جھکنے نہ پائے اور ہر ایک کو اپنا پورا پورا حق مل جائے۔

اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں میں ایک عدل بھی ہے یعنی عدل والا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

"قیامت کے دن جب کہ خدا کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصوں کو خدا اپنے سائے میں لے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا!" (بخاری)

پاکیزگی

عرب میں عام طور پر پانی کی کمی تھی اور اہل عرب اسلام سے پہلے صفائی اور پاکیزگی کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اسلام آیا تو حضور ﷺ نے ان لوگوں کو تاکید سے صاف ستھرا اور پاکیزہ رہنے کی ہدایات فرمائیں۔

نماز کی چار شرائط بتائی گئی ہیں:

۱۔ قبلہ رُخ ہونا۔

۲۔ اوقات کی پابندی کرنا۔

۳۔ ستر یعنی جسم کے جن اعضا کا ڈھانپنا ضروری ہے، ان کو ڈھانپنا۔

۴۔ پاکیزگی۔ یعنی باوضو ہونا۔ بدن، لباس اور نماز کی جگہ کا پاک ہونا۔

پاکیزگی اسلام کی نمایاں صفات میں سے ہے۔ دنیا کے بہت سے ادیان میں اس طرف چنداں توجہ نہیں دی گئی۔

ایک دن حضور ﷺ نے کسی شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوا کہ کپڑے دھولیا کرے۔ (ابوداؤد)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے دیوار پر تھوک کا دھبہ دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا۔ ایک انصاری عورت نے دھبے کو مٹایا اور اس کی جگہ خوشبو لاکر ملی تو آپ ﷺ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین فرمائی۔ (نسائی)

کبھی کبھی حضور ﷺ کی مجلس میں خوشبو کی انگیٹھیاں بھی جلائی جاتی تھیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا۔ (نسائی)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پاکیزگی کا اس قدر خیال تھا کہ جب سے اسلام لائے معمولاً ایک بار روزانہ غسل کرتے تھے۔ (مسند ابن حنبل)

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم غسل و پاکیزگی کے لیے حضرت انسؓ کے گھر میں ایک حمام موجود تھا۔ (بخاری)

حضرت ابوذر غفاریؓ بال رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن انھوں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں ان میں کنگھی کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں، کنگھی کرو؛ اور ان کو گرد و غبار سے بچاؤ۔" اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ وہ بسا اوقات دن میں دو بار ان میں تیل لگاتے! (مؤطا امام مالکؒ)

معاہدات کو پورا کرنا

حضور ﷺ کے نمایاں اوصاف میں سے ایک ایفائے عہد بھی تھا۔ آپ نے غیر مسلموں سے بھی معاہدات فرمائے اور ان کی پوری پابندی کی۔

صلح حدیبیہ میں حضور ﷺ اور کفار قریش کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی ایک شق یہ تھی کہ مکے سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آئے گا، وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا۔ عین اس وقت جب معاہدے کی شرائط لکھی جا رہی تھیں مکہ سے حضرت ابو جندلؓ حضور ﷺ کے

سامنے آگئے۔ حضرت ابو جندلؓ مسلمان ہو چکے تھے اور کافروں نے انھیں قید کر رکھا تھا اور انھیں ظلم وستم کا نشانہ بناتے تھے۔ حضور ﷺ کے حدیبیہ میں ہونے کا پتہ ملا تو وہ کسی نہ کسی طرح قید سے چھوٹ کر پابہ زنجیر وہاں آپہنچے اور التجا کی کہ مجھے اس ظلم وستم سے چھڑا کر مدینہ منورہ اپنے ساتھ لے جایا جائے۔

اب جو معاہدہ ہو رہا تھا اس کی رُو سے حضور ﷺ انھیں ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ کیوں کہ کفار کسی صورت نہیں مان رہے تھے اور دوسری طرف حضرت ابو جندلؓ کی حالت ایسی قابل رحم تھی کہ مسلمان انھیں دیکھ کر تڑپ اُٹھے تھے۔ حضور ﷺ نے کفار کے نمائندے سے کہا بھی کہ ابھی معاہدہ پورے طور پر نہیں لکھا گیا، تم لوگ ابو جندلؓ کو مستثنیٰ کردو۔ مگر وہ شقی کسی صورت نہ مانا۔ آخر آپؐ نے اپنے معاہدے پر قائم رہنا ہی ضروری سمجھا اور حضرت ابو جندلؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے ابو جندل! صبر کرو، ہم بد عہدی نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب تمھارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا!'' (بخاری)

جنگ بدر میں کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ انھیں دنوں دو صحابی مکے سے آرہے تھے۔ راہ میں کفار نے انھیں روک لیا اور انھیں اس وقت تک نہ جانے دیا جب تک ان سے عہد نہ لے لیا کہ تم لوگ جنگ میں رسولِ خدا کا ساتھ نہیں دو گے۔ ان دونوں نے مجبوراً عہد کر لیا اور پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری بات بتائی۔ باوجود اس کے کہ اس وقت جہاد کرنے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہم کو صرف خدا کی امداد درکار ہے! (مسلم)

اطاعتِ رسول ﷺ

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُو الرَّسُوْلَ (اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔) چناں چہ رسولِ خدا ﷺ کے جو احکام وقتی ہوتے تھے، صحابہ کرام فوراً ان کی تعمیل کرتے اور جو دائمی ہوتے تھے، ہمیشہ ان کے پابند رہتے تھے۔

حضور ﷺ کے زمانے میں عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں۔ ایک دن حضورؐ نے مسجد کے ایک دروازے کے متعلق فرمایا کہ کاش! ہم یہ دروازہ صرف عورتوں کے لیے چھوڑ

دیتے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس شدّت سے اس کی پابندی کی کہ تادمِ مرگ اس دروازے سے مسجد میں داخل نہ ہوئے! (ابوداؤد)

حضرت محمد بن اسلم نہایت کبیر السن صحابی تھے۔ جب بازار سے پلٹ کر گھر آتے اور چادر اُتارنے کے بعد یاد آتا کہ انھوں نے مسجد نبوی میں نماز نہیں پڑھی تو کہتے: "خدا کی قسم! میں نے مسجد رسول اللہ میں نماز نہیں پڑھی۔ حالاں کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ جو شخص مدینہ میں آئے تو جب تک اس مسجد میں دو رکعت نماز نہ پڑھ لے، گھر کو واپس نہ جائے۔ یہ کہہ کر چادر اٹھاتے اور مسجد نبوی میں نماز پڑھ کر گھر آتے! (اسد الغابہ)

حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ جو شخص جس قوم کے یہاں آئے وہ ان کی امامت نہ کرے بلکہ خود اسی قوم کا کوئی شخص ان کی امامت کرے۔ چناں چہ ایک بار حضرت مالک بن حویرثؓ ایک قبیلہ کی مسجد میں آئے۔ لوگوں نے امامت کی درخواست کی تو انھوں نے انکار کر دیا کہ رسولِ مقبول ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے! (ابوداؤد)

دُعا

اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو خصوصی رحمتیں نازل فرمائی ہیں، ان میں ایک بہت بڑی رحمت یہ ہے کہ اس نے اپنے اور انسان کے درمیان دعا کا وسیلہ رکھ دیا ہے شامِ غم ہو یا صبح مسرّت — یہ وسیلہ انسان کے لیے ہمیشہ انتہائی خیر و برکت کا باعث بنا رہتا ہے۔ دُعا کا مطلب ہے پکار۔ انسان کو جب بھی کوئی احتیاج پیش آتی ہے چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی، مادّی ہو یا رُوحانی، وہ اسی قادرِ مطلق کو پکارتا ہے۔ اور وہ رؤف و رحیم اس کی پکار کو سنتا اور اس کی احتیاج کو پورا کرتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شفقت کی انتہا ہے کہ اس نے اپنی عظیم ذات اور ضعیف البیان انسان کے درمیان دُعا جیسا مضبوط تعلق قائم کر دیا ہے اور اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ انسان اپنی احتیاج اس کے پاس بار بار لائے اور بار بار اس کے ابر کرم سے سیراب ہو۔ کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب میرا بندہ میرے بارے میں دریافت کرے تو اسے بتا دیا جائے کہ میں اس کے قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں۔

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے بھی مسلمانوں کو دُعا کرتے رہنے کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "دُعا عین عبادت ہے۔" اس کے بعد آپؐ نے سند کے طور پر یہ آیت پڑھی:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دٰخِرِينَ ۝ (المومن : ٦٠)

(تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دُعا مانگو، میں قبول کروں گا (اور تمہیں دوں گا۔) بے شک جو لوگ میری عبادت سے متکبرانہ رُوگردانی کریں گے انھیں ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں جانا ہوگا۔) (المؤمن، رواہ احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"دُعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔" (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ:

"اللہ کے ہاں کوئی اور چیز، کوئی اور عمل، دُعا سے زیادہ عزیز نہیں!" (ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے جس کے لیے دُعا کا دروازہ کھل گیا، اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے؛ اور اللہ کو سوالوں اور دُعاؤں میں سب سے زیادہ محبوب یہ ہے کہ بندے اس سے عافیت کی دُعا کریں۔ یعنی کوئی دُعا اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ محبوب نہیں!" (ترمذی)

نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ انسان اس سے دُعا کریں بلکہ جو انسان اس سے نہ مانگے، ان سے وہ ناراض ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے!" (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"اللہ سے اس کا فضل مانگو کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو محبوب رکھتا ہے کہ اس سے مانگا جائے (نیز آپؐ نے فرمایا کہ) اس بات کا انتظار کرنا کہ اللہ تعالیٰ بلا اور پریشانی کو دُور فرمائے گا، اعلیٰ درجے کی عبادت ہے!" (ترمذی)

دُعا کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ وہ ان مصائب کے لیے مفید ہوتی ہے جو نازل ہو چکی ہوں اور ان کے لیے بھی مفید ہوتی ہے جو ابھی نازل نہ ہوئی ہوں، بلکہ ان کا خطرہ اور اندیشہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"دعا نفع مند ہوتی ہے ان (مصائب) میں بھی جو نازل ہو چکی ہوں اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہ ہوئی ہوں۔ پس اے خدا کے بندو! دُعا کا اہتمام کرو!" (ترمذی)

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ تمھارے پروردگار میں بدرجۂ غایت صفت حیا اور کرم کی ہے۔ جب بندہ اس کے آگے مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ اسے خالی واپس کر دے! (ترمذی، ابوداوُد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"جو کوئی یہ چاہے کہ پریشانیوں اور تنگیوں کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرمائے تو اس کو چاہیے کہ عافیت اور خوشحالی کے وقت دُعا زیادہ کیا کرے!" (جامع ترمذی)

یعنی دُعا کو صرف مصیبت کے وقت ہی کے لیے نہیں اُٹھا رکھنا چاہیے بلکہ خوشحالی کے وقت بھی کثرت سے دُعا کرتے رہنا چاہیے۔ جو کوئی اس طرح خوش حالی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگتا رہے گا، وہ پھر جب تنگی کے وقت مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی التجا ضرور قبول فرمائے گا۔

حضور ﷺ نے دُعا مانگنے کے کچھ طریقے بھی بیان فرمادیئے ہیں۔ مثلاً:

دُعا مانگتے وقت قبولیت کا یقین رکھنا۔

دُعا کرتے وقت دل کا غافل نہ ہونا۔

عزم اور قطعیت کے ساتھ دُعا مانگنا۔

دُعا مانگ کر قبولیت کے لیے جلدی نہ مچانا۔

اپنے کھانے پینے میں حرام کمائی سے پرہیز کرنا۔

اپنے لیے بری دُعائیں نہ مانگنا۔

موت کی دُعا نہ کرنا۔

دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا اور نبی ﷺ پر درود بھیجنا۔

دُعا کے آخر میں آمین کہنا۔ (آمین کا مطلب ہے ایسا ہی ہو) وغیرہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"جب اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ ضرور قبول ہوگی اور جانے رہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول نہیں کرتا جس کا دل غافل اور بے پرواہو!"

(ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"جب تم میں سے کوئی دُعا کرے تو ایسے نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے اور اگر تو چاہے تو مجھ پر رحمت فرما اور تو اگر چاہے تو مجھے روزی دے۔ بلکہ اپنی طرف سے عزم اور قطعیت کے ساتھ خدا کے حضور میں اپنی مانگ رکھے۔ بے شک

وہ کرے گا وہی جو چاہے گا۔ کوئی ایسا نہیں کہ زور ڈال کر اس سے کرا سکے!" (بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"تمہاری دُعائیں اس وقت تک قبول ہوتی ہیں جب تک کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ (جلد بازی یہ ہے کہ) بندہ کہنے لگے کہ میں نے دُعا کی تھی مگر وہ قبول ہی نہیں ہوئی!" (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"اے لوگو! اللہ پاک ہے (اور) وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے اور اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے، وہی اپنے پاک بندوں کو دیا ہے۔ پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے کہ اے رسولو! تم حلال اور پاک غذا کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تمھارے اعمال کو۔ اہل ایمان کو مخاطب کر کے ان سے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! تم ہمارے رزق میں سے حلال اور پاک ہی چیزیں کھاؤ (اور حرام سے بچو) اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کر کے ایسی حالت میں جاتا ہے کہ (سفر کی طوالت کے باعث) اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم اور کپڑوں پر گرد و غبار ہے وہ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا (اُٹھا) کر دُعا کرتا ہے: اے میرے رب! اے میرے رب! اور حالت اس کی یہ ہے کہ اس کا کھانا بھی حرام (کمائی کا) ہے، اس کا پہننا بھی (حرام کمائی کا ہے) اور اس کا لباس بھی حرام (کمائی کا) ہے اور حرام کمائی ہی سے اس کی نشو و نما ہوئی ہے۔ تو (جب صورت یہ ہوگی کہ وہ حرام کمائی پر پل رہا ہو تو پھر) اس آدمی کی دُعا کیسے قبول ہوگی!" (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ:

"تم کبھی اپنے حق میں یا اپنی اولاد اور مال و جائداد کے حق میں بددُعا نہ کرو۔ مبادا وہ وقت دُعا کی قبولیت کا ہو اور اللہ تعالیٰ تمہاری وہ بددُعا قبول فرمالے (جس کے نتیجے میں خود تم پر یا تمہاری آل و اولاد یا مال و جائداد پر کوئی آفت آجائے)" (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی اپنی موت کی تمنا نہ کرے، نہ جلدی موت آنے کے لیے

اللہ سے دُعا کرے۔ کیوں کہ جب موت آجائے گی تو عمل کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا (اور پھر انسان کوئی نیک عمل نہیں کر سکے گا) اور مومن بندے کی عمر تو اس کے لیے بھلائی میں اضافہ کرتی ہے!" (مسلم)

فضالہ بن عبیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ایک شخص کو نماز میں دُعا کرتے سنا جس نے نہ اللہ کی تعریف کی اور نہ نبی ﷺ پر درود بھیجا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس آدمی نے دُعا میں جلد بازی کی، پھر آپ نے اس آدمی کو بلایا اور اس سے یا (اس کی موجودگی میں) کسی اور سے فرمایا کہ:

"تم میں سے جب کوئی نماز پڑھے تو (دُعا کرنے سے پہلے) اس کو چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے، پھر اس کے رسول (ﷺ) پر درود بھیجے۔ اس کے بعد جو چاہے مانگے!" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ابوزہیر نمیریؓ سے روایت ہے کہ ایک رات ہم رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ باہر نکلے تو ہمارا گزر اللہ کے ایک بندے پر ہوا جو بڑے الحاح سے اللہ سے دُعا مانگ رہا تھا۔ رسولِ کریم ﷺ کھڑے ہو کر اس کی دُعا سننے لگے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس نے مہر ٹھیک طرح لگائی تو جو کچھ اس نے مانگا ہے اس کا فیصلہ کرا لیا۔ لوگوں میں سے کسی ایک نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ ٹھیک مہر لگانے کا طریقہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: آخر میں آمین کہنا۔ اگر اس نے آخر میں آمین کہہ کر دُعا ختم کر دی۔ تو پھر اس نے جو کچھ مانگا ہے، اسے اللہ سے طے کروالیا! (ابوداؤد)

دُعا کے بارے میں حضور رسولِ خدا ﷺ کی جو احادیث ہیں، ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کون سی دُعائیں ہیں جو خصوصیت سے قبول ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے ان حالتوں اور ان اوقات کو بھی بیان فرمایا جن میں اللہ تعالیٰ خصوصیت کے ساتھ شرفِ قبولیت بخشتا ہے، مثلاً:

کسی مسلمان کا اپنے بھائی کے لیے دُعا مانگنا جب کہ وہ سامنے موجود نہ ہو۔

ماں باپ کا اولاد کے حق میں دُعا کرنا۔

مسافر کی دُعا۔

مظلوم کی دُعا۔

حاجی کی لوٹ کر گھر آنے سے پہلے پہلے کی دُعا۔

راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی دُعا۔

بیمار کی دُعا۔

وہ دُعا جو فرض نماز پڑھ کر کی جائے۔

وہ دُعا جو قرآن مجید ختم کر کے کی جائے۔

وہ دُعا جو اذان اور اقامت کے درمیان کی جائے۔

بارش برسنے کے دوران میں کی جانے والی دُعا۔

وہ دُعا جو کعبے شریف کے دیکھنے پر کی جائے۔

نماز کے دوران کی دُعا۔

وہ دُعا جو کسی جنگل بیابان میں بالکل تنہا ہونے کی حالت میں کی جائے۔

وہ دُعا جو رات کی ایک خاص گھڑی میں کی جائے۔

وہ دُعا جو رات کے آخری حصے میں کی جائے۔

حضرت ابو الدّرداءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"کسی مسلمان کی اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دُعا قبول ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک فرشتہ ہے جس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ جب وہ اپنے کسی بھائی کے لیے (غائبانہ) کوئی اچھی دُعا کرے تو وہ فرشتہ کہتا ہے کہ تیری یہ دُعا اللہ قبول کرے اور تیرے لیے بھی اسی طرح کی خیر عطا فرمائے!" (مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"تین دُعائیں ہیں جو خاص طور پر قبول ہوتی ہیں؛ ان کی قبولیت میں شک ہی نہیں ہے: ایک اولاد کے حق میں ماں باپ کی دُعا، دوسرے مسافر کی دُعا اور تیسرے اس کی دُعا جس پر ظلم ہوا ہو!" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: پانچ آدمیوں کی دُعائیں خاص طور پر قبول ہوتی ہیں:

مظلوم کی دُعا جب تک کہ وہ بدلہ نہ لے لے۔

حج کرنے والے کے دُعا جب تک کہ وہ لوٹ کر اپنے گھر نہ آجائے۔

جہاد کرنے والے کی دُعا جب تک کہ وہ (شہید ہو کر دنیا سے) لاپتہ نہ ہو جائے۔

بیمار کی دُعا جب تک کہ وہ شفایاب نہ ہو جائے۔ اور

ایک بھائی کی دوسرے بھائی کے لیے غائبانہ دُعا۔

یہ سب بیان فرمانے کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان دُعاؤں میں سب سے جلدی قبول ہونے والی دُعا کسی بھائی کے لیے غائبانہ کی جانے والی دُعا ہے۔ (دعوات کبیر، بیہقی)

عِرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"جو بندہ فرض نماز پڑھے (اور اس کے بعد دعا کرے) تو اس کی دُعا قبول ہوگی۔ اسی طرح جو آدمی قرآن مجید ختم کرے (اور دُعا کرے) تو اس کی دُعا بھی قبول ہوگی۔" (معجم کبیر للطبرانی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"اذان اور اقامت کے درمیان کی جانے والی دُعا رد نہیں ہوتی۔ (ترمذی، ابوداوٗد)

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

"چار مواقع ہیں جن میں دُعا خصوصیت سے قبول ہوتی ہے:

۱۔ راہِ خدا میں جنگ کے وقت۔

۲۔ جس وقت آسمان سے بارش ہو رہی ہو۔

۳۔ نماز کے وقت، اور

۴۔ جب کعبۃ اللہ نظر کے سامنے ہو۔" (معجم کبیر للطبرانی)

حضرت ربیعہ بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

"تین مواقع ہیں جب ان میں دعا کی جائے تو رد نہیں ہوگی: ایک تو یہ کہ کوئی شخص ایسے جنگل بیابان میں ہو جہاں خدا کے سوا اسے دیکھنے والا نہ ہو۔ وہاں وہ خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر نماز پڑھے (اور دُعا کرے)۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص میدان جہاد میں (دشمن کی فوج کے سامنے) ہو اس کے ساتھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں، مگر وہ ثابت قدم رہا ہو (اور اس حال میں دُعا کرے)۔ تیسرے وہ شخص جو رات کے آخری حصے میں خدا کے حضور کھڑا ہو!" (مسند ابن مندہ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

"رات میں ایک خاص گھڑی ہے؛ جو بندۂ مومن اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ سے دُنیا یا آخرت کی کوئی بھلائی مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ ضرور عطا فرمائے گا اور اللہ کا یہ کرم ہر رات میں ہوتا ہے۔" (مسلم)

حضور اکرم ﷺ کی اور احادیث بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مندرجہ ذیل مواقع پر بھی اللہ تعالیٰ دُعائیں قبول فرماتا ہے۔ مثلاً:

"شبِ قدر میں۔

عرفہ کے دن۔

میدانِ عرفات میں۔

جمعہ کے دن ایک خاص ساعت میں۔

روزہ افطار کرتے وقت۔

سفرِ حج میں، اور

سفرِ جہاد میں۔ وغیرہ"

دعا کی قبولیت کے سلسلہ میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قبولیت سے در حقیقت مراد کیا ہے۔ دُعا کی قبولیت کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ ہم مانگیں، ٹھیک وہی چیز ہمیں عطا کر دی جائے۔ کیوں کہ بعض اوقات ہم اپنے علم اور عقل کی کوتاہی کے باعث ایسی چیزیں مانگتے ہیں جو انجام کار ہمارے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں یا ان کا عطا کرنا حکمت الٰہی کے خلاف ہوتا ہے۔ چناں چہ یہ اس حکیم و دانا کی حکمت اور دانائی کے خلاف ہے کہ وہ ہمیں ضرور ہی ٹھیک وہی چیز عطا کرے جو ہم مانگیں، چاہے اس کا دیا جانا خیر کے بجائے شر کا باعث ہی بنتا ہو۔ پھر دوسری طرف اس کی کریمی کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کو خالی ہاتھ بھی نہ لوٹائے۔ چناں چہ وہ دُعا قبول تو ضرور کرتا ہے مگر قبولیت کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ کبھی تو ٹھیک اسی شکل میں قبول ہو جاتی ہے جس میں مانگی گئی تھی۔ کبھی اس دُعا کے عوض آخرت کی بیش بہا نعمتیں مل جاتی ہیں اور کبھی اس دعا کی برکت سے کوئی آنے والی آفت اور مصیبت ٹل جاتی ہے۔ غرضیکہ دُعا رائیگاں کبھی نہیں جاتی۔ جیسا کہ ذیل کی حدیث واضح کر رہی ہے:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

”جو مومن بندہ کوئی دُعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ کی بات نہ ہو اور نہ قطع رحمی ہو، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور عطا ہوتی ہے۔ یا تو جو کچھ اس سے مانگا ہوتا ہے اسے ہاتھ کے ہاتھ عطا کر دیا جاتا ہے، یا اس کی دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنادیا جاتا ہے یا آنے والی کوئی مصیبت اس دُعا کے حساب میں روک دی جاتی ہے۔ یہ سن کر صحابہؓ کرام نے عرض کیا کہ ”پھر تو ہم بہت زیادہ دُعائیں کریں گے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔“ (رواہ احمد)

مستدرک حاکم میں حضرت جابرؓ کی ایک روایت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جس شخص نے دنیا میں بہت سی ایسی دُعائیں کی ہوں گی جو بظاہر قبول نہیں ہوئی ہوں گی اسے جب ان دُعاؤں کے باعث جمع کیا ہوا آخرت کا اجر ملے گا تو وہ اس سے اتنا خوش ہو گا کہ پکار اٹھے گا:

”اے کاش، میری کوئی دُعا بھی دُنیا میں قبول نہ ہوئی ہوتی!“ (کنزل العمال)

کچھ مناجاتیں

اس کتاب کو، جس کا موضوع ہی اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، ختم کرنے سے پہلے کچھ مناجاتیں نقل کرنا مفید ہوگا۔ یہ وہ مناجاتیں ہیں، جو ان دلوں سے نکلیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی محبت گھر کر چکی تھی۔ سب سے پہلے تو خود رسولِ مقبول ﷺ کی مناجاتیں نقل کی جاتی ہیں جو محبان الٰہی کے سرتاج تھے!

حضور رسولِ مقبول ﷺ کی مناجاتیں

"پاک ہے وہ پروردگار جس نے عزّت و جلال کی چادر اوڑھ لی ہے اور مجد و کرم اس کا لباس و شعار ہے،
پاک ہے وہ ربّ قدوس جس کے سوا کسی کو تسبیح سزاوار نہیں،
پاک ہے بندوں پر فضل و انعام فرمانے والا،
پاک ہے جس کی خاص صفت عظمت و کرم ہے،
پاک ہے ربّ ذوالجلال والاکرام۔" (ترمذی)

"اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے، غیب و شہود کا پورا علم رکھنے والے، ہر چیز کے پروردگار اور مالک! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ میں تیری پناہ چاہتا ہوں اپنے نفس کے شر سے اور شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے!" (ترمذی)

"اے خدا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی اور کاہلی سے، نکما کر دینے والے بڑھاپے سے، کبر سنی کے برے اثرات سے، دنیا کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے!" (مسلم)

"اے اللہ! ہم تیری پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ ہمارے قدم بہکیں اور ہم غلط راہ

پر چلیں، یا کسی پر ظلم وزیادتی کریں، یا ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی کی جائے۔ یا ہم کسی کے ساتھ جہالت سے پیش آئیں یا کوئی ہمارے ساتھ جہالت سے پیش آئے!" (ترمذی)

"اے اللہ! ہمارے دلوں کو جوڑ دے خیر اور بھلائی پر اور ہمارے تعلقات درست کر دے اور ہمیں سلامتی کی راہوں پر چلا اور ہمیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی فضا میں لا اور ہمیں ظاہر اور باطن کی تمام گندگیوں سے بچائے رکھ اور ہمیں برکت دے ہمارے کانوں میں اور ہماری آنکھوں میں اور ہماری بیویوں میں اور ہماری نسل میں اور ہماری دُعا قبول کر؛ بیشک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے!" (ابو داوٗد)

"اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ علم جو نفع دے اور وہ عمل جو تیری نگاہ میں قابل قبول ہوں اور وہ رزق جو پاک ہو!" (رواہ رزین)

"اے اللہ! ہماری پردہ داری فرما اور ہماری گھبراہٹ اور بے خوفی کو اطمینان سے بدل دے!" (رواہ احمد)

"اے اللہ! میری دینی حالت درست فرمادے، جس پر میری خیریت اور سلامتی کا دار و مدار ہے اور میری دُنیا بھی درست فرمادے جس میں مجھے یہ زندگی گزارنا ہے اور میری آخرت بھی درست فرمادے جہاں لوٹ کر مجھے جانا ہے اور میری زندگی کو ذریعہ بنادے ہر قسم کی بھلائی کا اور میری موت کو ذریعہ بنادے ہر قسم کے شر سے راحت پا جانے کا!" (مسلم)

"اے میرے اللہ! اے میرے پروردگار اور ہر چیز کے پروردگار! میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی پروردگار ہے، اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔"

"اے اللہ! اے ہمارے پروردگار اور ہر چیز کے پروردگار! میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) تیرا بندہ اور تیرا رسول ہے!"

"اے اللہ! اے ہمارے پروردگار اور ہر شے کے پروردگار! میں گواہی دیتا ہوں کہ سب تیرے بندے اور آپس میں بھائی بھائی ہیں!

"اے اللہ! اے ہمارے پروردگار اور سب چیزوں کے پروردگار! مجھے اور

میرے گھر والوں کو ہمیشہ کے لیے دنیا اور آخرت کی ایک ایک ساعت کے لیے اپنا مخلص اور فرماں بردار بندہ بنالے۔"

"اے جاہ و جلال اور اکرام والے! میری التجا سن لے اور میری دُعا قبول کرلے!" (ابوداؤد)

"اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور دجال کے فتنے سے اور زندگی اور موت کے سارے فتنوں سے اور گناہ کے ہر کام سے اور قبر کے بار سے!" (صحیحین)

"اے اللہ! رب ساتوں آسمانوں کے اور ان چیزوں کے جو ان کے نیچے واقع ہیں اور رب ساری زمینوں کے اور ان چیزوں کے جو ان کے اوپر واقع ہیں!"

"اور رب شیطان کے اور ان کی گمراہ کن سرگرمیوں کے! اپنی ساری مخلوق کے شر سے مجھے اپنی پناہ اور حفاظت میں لے لے، کوئی مجھ پر زیادتی اور ظلم نہ کرنے پائے۔ باعزت اور محفوظ ہے وہ جسے تیری پناہ حاصل ہو!" (ترمذی)

"اے اللہ! میرے سارے گناہ بخش دے۔ چھوٹے بھی، بڑے بھی، اگلے بھی، پچھلے بھی، کھلے بھی اور ڈھکے چھپے بھی!" (مسلم)

"اے میرے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں دین میں ثابت قدمی اور حق و ہدایت پر استواری و مضبوطی اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تیری نعمتوں کا شکر کروں اور تیری عبادت اچھی طرح کروں اور میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ دل جس میں روگ نہ ہو اور وہ زبان جو سچ بولنے والی ہو اور میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ بھلائی جو تیرے علم میں ہے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس شر سے جو تیرے علم میں ہے اور تیری بخشش مانگتا ہوں ان گناہوں سے جنھیں تو جانتا ہے!" (نسائی)

"اے اللہ! میں مانگتا ہوں تیرا خوف خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی اور میں تجھ سے مانگتا ہوں مخلصانہ بات کہنے کی توفیق رضامندی کی حالت میں بھی اور ناراضی کی حالت میں بھی اور اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اعتدال کی راہ تنگ دلی میں بھی اور خوش حالی میں بھی اور میں مانگتا ہوں تجھ سے تقدیر پر راضی رہنے کی صفت، اور

میں تجھ سے مانگتا ہوں آنکھ کی ٹھنڈک جو کبھی ختم نہ ہو اور موت کے بعد کا جاودانی عیش...."(نسائی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مناجات

"اے معبود! میں وہی ناچیز ہوں جس کی تونے پرورش کی، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی حقیر ہوں جسے تونے سربلند کیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی بے قدر ہوں جس کی تونے عزت بڑھائی، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی ذلیل ہوں جسے تونے سرفراز کیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی سائل ہوں، جسے تونے عطا کیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی رغبت رکھنے والا ہوں جسے تونے راضی کیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی محتاج ہوں جسے تونے غنی کیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی گمراہ ہوں جسے تونے راہ پر لگایا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی جاہل ہوں جسے تونے علم دیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔
اور میں وہی گمنام ہوں جسے تونے شرف دیا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔

اور......
میں وہی خطاکار ہوں جسے تونے معاف فرمایا، لہٰذا تیری تعریف ہے۔

حضرت امام زین العابدین، علی کی مناجات

"اے اللہ! اے وہ ذات جس کی عظمت کی عجائبات کی انتہا نہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی آل پر رحمت نازل کر اور ہمیں اپنی عظمت کا انکار کرنے سے دُور رکھ!"
"اے وہ ہستی جس کی حکومت کی مدّت کبھی ختم نہیں ہوگی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی آل پر رحمت نازل کر اور ہماری گردنوں کو عذاب سے آزاد فرما۔"
"اے وہ معبود! جس کی عظمت کے خزانے ابدی و سرمدی ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور اپنی رحمت میں سے ہمارے لیے حصہ مقرر فرما۔

"اے وہ ذات! جس کے دیدار سے نگاہیں قاصر ہیں، محمد (ﷺ) اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور ہمیں اپنے (مقام) قرب سے قریب کر!

"اے وہ ہستی! جس کی قدر و منزلت کے آگے تمام قدریں حقیر ہیں، محمد (ﷺ) اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور ہمیں اپنے نزدیک مکرّم فرما!

"اے وہ معبود! جس کے نزدیک پوشیدہ خبریں ظاہر ہیں، محمد (ﷺ) اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور ہمیں اپنے نزدیک رُسوا نہ کر!"

حضرت ذوالنون مصری کی مناجات

"اے اللہ! حیوانات کی آوازوں میں،
درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ میں،
موجوں کے شور میں،
پانی کے بہاؤ میں،
پرندوں کے نغموں میں،
شفق کی سرخی میں،
طلوع آفتاب کی روشنی میں،
ہواؤں کی سنسناہٹ میں،
اور بجلی کی کڑک میں،

غرضے کہ ہر شے میں، تیری توحید ذاتی کی شہادت اور تیری یکتائی کی دلیل بچشم خود ملاحظہ کرتا ہوں۔ نیز یہ یقین رکھتا ہوں کہ تو...

بے ہمتا ہے،
بے نظیر ہے،
بے مثل ہے،
ہمہ جا حاضر و ناظر ہے،
عالم و قادر اور عادل و حکیم مطلق ہے،

تیری ذات ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے،
تو جہالت، حماقت، نادانی، ظلم اور کذب سے منزّہ ہے،
میں تمام مصنوعات میں تیری صفت اور قدرت کا مشاہدہ کرتا ہوں۔
مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری رضا طلب کروں اور میری رضا طلب میں ہو۔" آمین!

حضرت رابعہ بصریہ کی مناجات

حضرت رابعہ بصریہ عشاء کی نماز کے بعد چھت پر چڑھ جاتیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں ملتجی ہوتیں:

"پروردگار! ستارے روشن ہو گئے، لوگ سو گئے، بادشاہوں نے دروازے بند کر لیے، ہر حبیب اپنے حبیب سے محوِ خلوت ہے اور میں یہاں تیرے سامنے کھڑی ہوں!"

پھر ساری رات نمازیں پڑھتیں۔ فجر ہونے پر تلاوت قرآن میں مشغول ہو جاتیں جب روشنی پھیل جاتی اس طرح مناجات کرتیں:

"اے خدا! رات گزر گئی، دن آ گیا، کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ تو نے میری نماز قبول کر لی یا رد کر دی۔ تیری عزّت کی قسم! میرا ابھی یہی طریقہ رہے گا جب تک تو مجھے جواب نہ دے گا یا میری مدد نہ کرے گا۔ قسم ہے تیری عزّت کی، اگر تو مجھے اپنے دروازے سے دھتکار بھی دے گا تو بھی میں نہ ٹلوں گی کیوں کہ میرے دل میں تیری محبت گھر گئی ہے...."

کبھی آپ اللہ تعالیٰ سے یوں ملتجی ہوتیں:

"اے اللہ! میں اپنے قول و فعل سے تیری پناہ چاہتی ہوں ہر اس چیز کے بارے میں جو مجھے تیرے سوا کسی اور میں مشغول کر دے اور ہر حائل ہو جانے والے سے جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہو جائے!"

"اے میرے آقا! مقرب بندے خلوتوں میں تیرا قرب ڈھونڈتے ہیں، سمندروں میں مچھلیاں تیری عظمت کے گیت گاتی ہیں اور تیرے مقدس جلال کی وجہ سے موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں!"

☆ ☆ ☆